ماہنامہ

الریاض

سلسلہ عالیہ سراجیہ حقانیہ

صفر ۱۴۲۷ھ / مارچ ۲۰۰۶ء شمارہ (۱)

جملہ گنج فیض کِس شے کی کمی کلیر میں ہے
اللّٰہ اللّٰہ دوجہاں کی سروری کلیر میں ہے

ماہنامہ **الریاض**

صفر ۱۴۲۷ھ / مارچ ۲۰۰۶ء شمارہ (۱)

سلسلہ عالیہ سراجیہ حقانیہ

ویب سائٹ: www.haqqaniya.org

ای میل: info@haqqaniya.org

فہرست

		صفحہ نمبر
حمد باری تعالٰی	کلام: مولانا حسن رضا خان صاحبؒ	۱
نعت	کلام: خواجہ غلام قطب الدّین فریدی دامت برکاتہم العالیہ	۲
نذرانۂ عقیدت (صابر پیاؒ)	-	۳
سید علی احمد صابر کلیریؒ	-	۴
عالمِ روحانی	تحریر: خواجہ عبد الحکیم انصاری نقشبندیؒ	۱۶
پہلی اذان	صحابۂ رسول سیدنا بلال رضی اللّٰہ عنہ کی آپ بیتی سے اقتباس	۲۵
کدھر جانا ہے	تحریر: ابدال بیلا صاحب	۲۹
حدیثِ دل	-	-

اراکین

محمد ندیم کھوکھر سراجی حقانی

علی سلطان قریشی سراجی حقانی

غلام مرتضیٰ سراجی حقانی

محمد عمران سراجی حقانی

فہد حمید

محمد رضوان عالم قادری — گرافکس ڈیزائنر، کمپوزر

حمد باری تعالٰی

ہے پاك رتبہ فِکر سے اِس بے نیاز کا
کچھ دَخل عقل کا ہے نہ کام امتیاز کا

شہ رگ سے کیوں وصال ہے آنکھوں سے کیوں حجاب
کیا کام اس جگہ خِردِ ہرزہ تاز کا

لب بند اور دل میں وہ جلوے بھرے ہوئے
اللّٰہ رے جگر ترے آگاہِ راز کا

غش آگیا کلیم سے مشتاق دید کو
جلوہ بھی بے نیاز ہے اس بے نیاز کا

ہر شے سے ہیں عیاں مرے صانع کی صنعتیں
عالم سب آئینوں میں ہے آئینہ ساز کا

افلاك و ارض سب ترے فرماں پزیر ہیں
حاکم ہے تو جہاں کے نشیب و فراز کا

اس بیکسی میں دل کو مرے ٹیك لگ گئی
شہرہ سُنا جو رحمتِ بیکس نواز کا

مانند شمع تیری طرف لَو لگی رہے
دے لطف میری جان کو سوز و گداز کا

تو بے حساب بخش کہ ہیں بے شمار جرم
دیتا ہوں واسطہ تجھے شاہِ حجاز کا

بندے پہ تیرے نفس لعیں ہوگیا محیط
اللّٰہ کر عِلاج مری حِرص و آز کا

کیوں کر نہ میرے کام بنیں غیب سے حسنؔ
بندہ بھی ہوں تو کیسے بڑے کار ساز کا

کلام: مولانا حسن رضا خان صاحبؒ

نعت

کوئی ہم پایہ نہ ثانی ترا کونین میں ہے
تجھ سا بے سایہ نظر آیا نہ دارین میں ہے

عین ملتا ہے جو رب سے تو عرب بنتا ہے
اك حقیقت ہے جو پوشیدہ اسی عین میں ہے

سر تو بس حکم پہ جھکتا ہے سوئے بیتِ حرم
سجدۂ دل رخِ محبوب کے قوسین میں ہے

عرشِ اعلیٰ کا بھی اعزاز بڑھا ہے اِن سے
سلسلہ فیض کا ایسا ترے نعلین میں ہے

جگمگاتے ہیں اسی سے مرے باطن کے نقوش
جلوۂ حسنِ ازل ایسا رچا نین میں ہے

گور میں آ کے چلے جائیں گے کچھ پوچھے بغیر
پاسداری تری نسبت کی نکیرین میں ہے

عشقِ سرکارؐ نے ہر غم سے کیا ہے آزاد
مفلسی میں بھی مری روح بڑے چین میں ہے

لیلیٰئ یاد سے آباد ہوا محملِ جاں
ناقۂ عشق نبیؐ دوڑتی دن رین میں ہے

جس کے انوار سے ہے قطبؔ زمانہ روشن
ہے وہی نور جو سِبطینِ کریمین میں ہے

کلام: خواجہ غلام قطب الدّین فریدی دامت برکاتہم العالیہ

سنیے: http://www.haqqaniya.org/Audio/Mehfil/2005-05%20(May)/11.ram

نذرانۂ عقیدت

بحضور حضرت مخدوم عَلاؤالدِّین علی احمد صابر کلیری رحمة اللّٰه علیه

بادشاہِ دو جہاں ۔ ختم اللّٰه ارواح ۔ سلطان الاولیاء

کیا کہوں چھوٹا ہے مُنہ ہستی بڑی کلیر میں ہے
نورِ حق کی برملا جَلوہ گری کلیر میں ہے

جملہ گنج فیض کِس شے کی کمی کلیر میں ہے
اللّٰہ اللّٰہ دوجہاں کی سروری کلیر میں ہے

پنجتن کے باغ کی بُوٹی لگی کلیر میں ہے
مصطفیٰؐ کلیر میں ہے مولا علیؓ کلیر میں ہے

لختِ دِل زہرہؓ کے اور نورِ نظر حسنینؓ کے
غوث بھی کلیر میں ہے ہندالولی کلیر میں ہے

لاکھوں پروانے کیا کرتے ہیں روضے کا طواف
مشعل گنجِ شکرؒ روشن ہوئی کلیر میں ہے

سائیلو آؤ یہاں جو مانگنا ہے مانگ لو
کہ علاؤالدینؒ سخی اِبنِ سخی کلیر میں ہے

صابریؒ دربار بھی ہے سجدہ گاہِ قدسیاں
بادشاہ کیا شے گداگر ہر ولی کلیر میں ہے

رات دن ہیں اشك جاری بس انہی کی یاد میں
جسم گو میرا یہاں ہے رُوح مری کلیر میں ہے

تُو بھلا مایوس کیوں ہے تیری بھی اکثر رحیمؔ!
بگڑی بن جائیگی لاکھوں کی بنی کلیر میں ہے

سید علی احمد صابر کلیری رحمت اللّٰہ علیہ

آپ کا نامِ نامی علی احمد اور علاءُ الدّین صابر لقب ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب والد صاحب کی طرف سے سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمت اللّٰہ علیہ سے ہوتا ہوا سیّدنا امام حسن رضی اللّٰہ عنہ تك جا پہنچتا ہے جبکہ والدہ کی طرف سے حضرت فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللّٰہ عنہ تك پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ حضرت سیدہ ہاجرہ رحمت اللّٰہ علیہا حضرت زہد الانبیاء فرید الدّین گنج شکر رحمت اللّٰہ علیہ کی ہمشیرہ ہیں۔

آپ کے جد امجد غوثِ صمدانی عبد القادر جیلانی رحمت اللّٰہ علیہ کے والد گرامی حضرت ابو صالح جنگی دوستؒ گیلان (سلطنت ایران) میں رہائش پذیر تھے۔ حضرت غوث اعظم رحمت اللّٰہ علیہ تعلیم کے لیے بغداد تشریف لائے تو یہیں قیام فرما لیا۔ اِن کے بعد اِن کے صاحبزادے حضرت سیف الدّین عبد الوہاب رحمت اللّٰہ علیہ بھی بغداد میں رہے۔ ہلاکو خان نے جب بغداد شہر کو اپنے ظلم و جفا کا نشانہ بنایا تو حضرت سیدنا عبد الرّحیم عبد السّلام بن عبد الوہاب رحمت اللّٰہ علیہ بغداد سے سکونت ترك کر کے ہرات (کابل) تشریف لے آئے۔ ۱۱ ذیقعد ۵۴۱ھ بروز پیر شاہ عبد الرّحیم عبد السّلام والد سیّد مخدوم علی احمد صابر رحمت اللّٰہ علیہ تولد ہوئے۔

شیخ المشائخ حضرت محمد ابو القاسم گرگانی رحمت اللّٰہ علیہ کو کشف ہوا کہ شاہ عبد الرّحیم رحمت اللّٰہ علیہ کے یہاں ایك صاحبِ جلالت فرزند پیدا ہوگا جو شیخ فرید الدّین گنج شکر رحمت اللّٰہ علیہ کی ہمشیرہ صاحبہ رحمت اللّٰہ علیہا کے بطن سے ہو گا۔ حضرت ابو القاسم رحمت اللّٰہ علیہ شاہ عبد الرّحیم رحمت اللّٰہ علیہ کو ہمراہ لے کر پنجاب موضع کہووال ضلع ملتان میں آئے اور ۱۷ جمادی الآخر ۵۷۱ھ کو نکاح کی تقریب سر انجام ہوئی۔ حضرتؒ ایك سال چھ ماہ یہاں ٹھہرے پھر اپنی زوجہ محترمہؒ کو لے کر ہرات واپس چلے گئے۔

حضرت شاہ عبد الرّحیم رحمت اللّٰہ علیہ کا ایك رافضی مولوی برہان دشمن تھا اور آپ کو ایذا پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ایران میں بوجہ رفض غوثِ اعظمؒ کے اعداء بہت تھے اور آپ چونکہ حضرت غوثِ اعظمؒ کی اولاد سے تھے اس لیے آپ کو بالکل اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ایك دن مخدوم علاء الدّین علی احمد صابر رحمت اللّٰہ علیہ کی والدہؒ نے اپنے سرتاج شاہ عبد الرّحیمؒ کو اپنا خواب سناتے ہوئے فرمایا "آج رات خواب میں آپ کے جد امجد غوثِ پاکؒ تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ عبد الرّحیم دشمنوں کی طرف سے غم نہ کرے۔ عنقریب شانِ قہاری سے ایك فرزند پیدا ہوگا۔ اسکی ولادت باسعادت کی برکت سے دشمن ختم ہوجائیں گے"۔

۱۹ ربیع الاوّل ۵۹۲ھ بشب جمعرات بعد از تہجد کہ ایك پہر رات باقی تھی کہ بادشاہ دو جہاں سید مخدوم علی احمد صابر رحمت اللّٰہ علیہ کا اس دنیا میں ظہور ہوا۔ صاحب انوار الشہود لکھتے ہیں کہ دایہ

کا بیان ہے کہ میری طاقت نہ ہوئی کہ میں آپ کو بے وضو غسل کراؤں۔ آپ کی ولادت ہوتے ہی مولوی برہان مر گیا۔ شہر ہرات میں آپ کی پیدائش کی شہرت ہوئی۔ دشمنوں پر قدرتی ہیبت طاری ہو گئی۔

دایہ نے غسل دے کر علی احمد صابرؒ کو ان کی والدہ کی گود میں لٹایا۔ آپ نے جو اوپر کی جانب نظر فرمائی تو چھت سے ایک آواز بلند ہوئی۔ اس آواز کو مالک مکان محمدؒ بن اسحاق نے سن کر والدۂ مخدومؒ سے کہا "بیٹی! بچے کو لے کر باہر آ جائیں، چھت گرا چاہتی ہے"۔ ابھی یہ گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پختہ چھت پسِ پشت مکان جا پڑی۔ آسمان صاف نظر آنے لگا۔ ابر کے ٹکڑے آسمان سے نازل ہوئے اور سیّد مخدوم صابرؒ کو آغوش میں لے کر آسمان کی رفعتوں میں غائب ہو گئے۔ مکان میں اور کچھ دیر بعد سارا شہر خوشبو سے مہک اُٹھا۔ صبح تک یہی منظر رہا۔

آپ کے والد مکرم شاہ عبد الرّحیم رحمت اللّٰہ علیہ سے روایت ہے کہ میں ایک روز مراقبہ میں تھا کہ ایک سانپ میرے اوپر آ پڑا۔ میں نے جو آنکھیں کھولیں تو دیکھا ایک مہیب شکل اژدہا سر سے دُم تک چِرا ہوا ہے جس کا ایک حصہ میرے اوپر آ گرا اور دوسرا زمین پر جا پڑا۔ سید مخدومؒ چِرے ہوئے سانپ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سید مخدومؒ کی والدہؒ کو نیند سے بیدار کیا اور واقعہ معائنہ کرایا۔ والدۂ مخدومؒ نے عرض کیا "میں ابھی خواب میں تھی کہ سید مخدومؒ مجھ سے کہہ رہے تھے آج کے بعد کوئی سانپ میرے خاندان کو نہیں ڈسے گا۔ میں نے سانپوں کے بادشاہ کو مار دیا ہے۔ روئے زمین کے تمام سانپ مجھ سے خائف ہیں"۔ کہتے ہیں یہ خواب سنکر میں سانپ کے ٹکڑوں کو باہر لے گیا۔ حضرت محمدؒ بن اسحاق، حضرت ابو القاسم گرگانیؒ اور شیخ عبد اللّٰہؒ و دیگر بزرگانؒ نے سانپ کو ملاحظہ کیا اور کہا حقیقتاً یہ سانپوں کا بادشاہ ہے۔ اس واقعہ کے وقت آپ کی عمر دو سال تھی۔

حضرتؒ پیدائشی صابر تھے۔ آپ نے ۷ ماہ دس دن اپنی والدہ کا دودھ نوشِ جان کیا۔ یومِ ولادت سے ایک سال کامل یہ معمول رہا کہ ایک روز بعد شیر نوش فرماتے اور ایک روز صائم رہتے۔ دوسرے سال سو روز صائم رہتے اور تیسرے روز شیر نوش فرماتے۔ تیسرے برس میں خود بخود شیرِ مادر سے منہ پھیر لیا اور تین روز صائم رہتے اور چوتھے روز روغنی نان دیا جاتا تو نہ کھاتے، جَو کی روٹی تناول فرما لیتے۔ چوتھے سال جو آپ نے زبانِ مبارک کھولی تو کلمہ "لا موجود الا اللّٰہ" صادر فرمایا۔

چھوتھا سال کامل اکثر یہی کلمہ آپ کی زبان سے سنا جاتا اور کچھ نہ فرماتے اور جس وقت یہ کلمہ فرماتے حال وارد ہو جاتا۔ دن میں سات وقت کعبۃ اللّٰہ کی طرف سجدہ کیا کرتے، اول صبح دوم دوپہر سوم سہ پہر چہارم عصر پنجم مغرب ششم عشاء ہفتم تہجد۔ چار سال کی عمر ہی میں شب کو کم سوتے اور جب سوتے تو چونک کر بیدار ہو جاتے۔

حضرت سید مخدومؒ کی عمرِ پاک دو دن کم پانچ سال ہوئی تھی کہ ۱۷ ربیع الاوّل ۵۹۷ھ کو بروز دو شنبہ بعد از نمازِ ظہر شاہ عبد الرّحیم رحمت اللّٰہ علیہ کے زیرِ ناف درد پیدا ہوا جو دم بدم ترقی پزیر ہوتا گیا۔ حضرت ابو القاسمؒ اور دوسرے بزرگانؒ نے سید مخدومؒ کو بتا کر دعا کے لیے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا "آسمان پر شور ہو رہا ہے۔ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کی سواری تیار ہو رہی ہے۔ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ

وسلم میرے والد مکرمؒ کو خلعت پہنا کر جنت میں لے جائیں گے۔ دُعا سے کچھ حاصل نہ ہو گا"۔ عین اسی وقت جب کہ سید مخدومؒ کی زبان معجز بیان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حضرت شاہ عبد الرّحیم عبد السّلام بن عبد الوہاب بن غوثِ اعظم رضی اللّٰہ عنہ و عنہم کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ نماز جنازہ کے بعد بیرون شہر ہرات جانبِ شمال آپ کو دفن کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

والد مکرمؒ کی وفات کے ایک سال تک حضرت سید مخدومؒ بالکل خاموش رہے، کسی سے کلام نہ فرمایا۔ آپ کے والد گرامیؒ کے احباب جب آپ کے پاس آتے اور فرطِ محبت سے آپ کو بوسہ دیتے تو ان پر وجد طاری ہو جاتا۔ یہ کیفیت کسی پر ساعت، کسی پر دو ساعت اور کسی پر ایک پہر رہتی۔ والد گرامیؒ کی وفات کے بعد عسرت سے زندگی بسر ہونے لگی۔ کبھی فقط پانی پر گزارا کرتے، کبھی خشک نانِ جویں کا ٹکڑا مل جاتا تو کھا لیتے۔ آپ کی والدہؒ بھی صابرہ تھیں، کبھی اپنی حالت کسی سے نہ بیان کی۔

ایک دن سید مخدومؒ نے اپنی والدہ سے بھوک کی شکایت کی لیکن دوپہر تک والدہ نے کھانا نہ دیا۔ ہنڈیا چولہے پر رکھ دی تا کہ معلوم ہو کہ کچھ پک رہا ہے لیکن اس میں صرف پانی تھا۔ دوپہر کے بعد حضرتؒ نے دوبارہ کھانا طلب کیا اور عرض کیا "کیا صبح سے کھانا نہیں پکا؟"۔ والدہ صاحبہؒ نے فرمایا "کھانا ابھی کچا ہے، پک جانے پر کھلاؤں گی"۔ آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ چلو کچا ہی کھا لیتے ہیں ہنڈیا کا ڈھکنا اُٹھایا اور فرمایا "امی جان چاول پک گئے ہیں"۔ والدہ مکرمہؒ نے جو دیکھا تو واقعۃً ہنڈیا میں نہایت خوشبودار لذیذ چاول موجود تھے۔ دونوں نے تناول فرمائے۔ کھانے سے فراغت کے بعد والدہ سید مخدومؒ نے حضرت سیّد ابو القاسم رحمت اللّٰہ علیہ کو اس کرامت کی اطلاع دیتے ہوئے چاول دکھائے۔ حضرت ابوالقاسمؒ نے دوسرے ساتھیوں کو دکھائے۔ سب نے تبرکاً تناول فرمائے۔ سب نے آپس میں مشورہ کر کے آپ کی والدہ محترمہؒ سے عرض کیا "سید مخدومؒ کو باطنی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ان کو مسعُود العالَمین گنج شکرؒ کی بارگاہ میں لے جاؤ۔ وہی انکی باطنی تربیت فرما سکتے ہیں"۔ لہٰذا سید مخدومؒ اپنی والدہؒ اور حضرت ابو القاسمؒ کی معیت اجودھن (پاک پٹن شریف) ۲۵ شعبان المعظم ۶۰۰ھ کو وارد ہوئے۔ والدہ محترمہؒ نے اپنے بیٹے سید مخدومؒ کو اپنے محترم بھائی فرید الدّین گنج شکرؒ کی گود میں دے دیا اور کہا "بھائی یتیم بچے کی تربیت فرمائیے"۔ حضرت سید مخدومؒ نے تین سال کے عرصہ میں علوم ظاہری حاصل کیا جب کہ دوسرے لڑکے چھ سال میں کرتے تھے۔

تقریباً اکتیس سال کی عمرِ پاک میں بروز جمعرات بعد نماز اشراق حضرت بابا جیؒ نے سید مخدومؒ کو اپنے دستِ اقدس پر سلسلہ ادہمیہ چشتیہ میں مرید فرمایا۔ مرید ہونے کے دو سال بعد تک سید مخدومؒ نے حجرہ سے باہر قدم نہ رکھا۔ عبادت الٰہی میں مستغرق رہے۔ وہ حجرہ تاہنوز موجود ہے اور حجرہ کے قریب جانے سے رقت طاری ہوتی ہے۔

ایک دن آپ کی والدہ محترمہؒ اپنے بھائی فرید الدّین گنج شکرؒ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر گویا ہوئیں "بھائی جان! میں تو ہرات واپس جا رہی ہوں۔ اپنے نورِ نظر کو آپ کے سپرد کئے جا رہی ہوں۔ ان کا خاص خیال رکھنا، میرا بیٹا بھوکا نہ رہے۔ انشاء اللّٰہ العزیز اگر زندہ رہی تو بارہ سال کے بعد واپس آ کر اسکی شادی

رچاؤں گی"۔ حضرت بابا جیؒ نے اپنی ہمشیرہؒ کی موجودگی میں سید مخدومؒ کو بلا کر لنگر کی تقسیم ان کے سپرد کی اور فرمایا "علی احمد! کل سے تم صبح و شام غرباء مساکین میں لنگر تقسیم کیا کرو"۔ اس پر والدہ سید مخدومؒ بہت مسرور ہوئیں اور سید مخدومؒ کو اپنے عظیم بھائی کی کفالت میں چھوڑ کر خود حضرت ابو القاسم رحمت اللّٰہ علیہ کے ہمراہ ہرات تشریف لے گئیں۔ ادھر حضرت مخدومؒ لنگر تقسیم کرنے باہر تشریف لاتے (علاوہ ازیں حجرہ میں تنہا مستغرق رہتے) لیکن اس میں سے خود نہ کھاتے۔ درختوں کے پتے اور جنگلی پھل کھا کر شکم پوری فرماتے۔

شاہ محمد حسن چشتی صابری رامپوری رحمت اللّٰہ علیہ فرماتے ہیں "آپ نے یہ معمول رکھا کہ نمازِ اشراق پڑھ کر لنگر تقسیم کرنے کو حجرہ سے باہر آیا کرتے تھے اور بعد لنگر تقسیم کر دینے کے ایک حجرہ میں دروازہ بند کر کے تنہا رہا کرتے تھے اور شغلِ نوری کیا کرتے تھے۔ نمازِ مغرب کر بعد پھر لنگر تقسیم کرنے کو حجرہ سے باہر تشریف لاتے تھے اور بعد لنگر تقسیم کر دینے کے لنگر خانہ میں یہ دعائے نوری ایک مرتبہ بآواز تلاوت کر کے اپنے حجرہ میں چلے جاتے تھے"۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ لِیْ نوراً فِیْ قَلْبِیْ وَ نوراً فِیْ قَبْرِیْ وَ نوراً فِیْ سَمْعِیْ وَ نوراً فِیْ بَصَرِیْ وَ نوراً فِیْ شَعْرِیْ وَ نوراً فِیْ بُشْرِیْ وَ نوراً فِیْ لَحْمِیْ وَ نوراً فِیْ دَمِیْ وَ نوراً فِیْ مُخِّیْ وَ عِظَامِیْ وَ نوراً بَیْنَ یَدَیَّ وَ نوراً مِّنْ خَلْفِیْ وَ نوراً عَنْ یَمِیْنِیْ وَ نوراً عَنْ شِمَالِیْ وَ نوراً مِّنْ فَوْقِیْ وَ نوراً مِّنْ تَحْتِیْ وَسَلَّمَ حَقًّا ھُوَ

شغلِ نوری کے بارے میں آپ فرماتے ہیں "یہ شغل شریف مثل آبِ حیاتِ ابدی کے ہے۔ شاغل اس شغل لطیف کا انوار حق سبحانہٗ و تعالٰی سے شکم سیر رہتا ہے اور صورت حضرت شیخ کی بانوار حضرت وحدت کے ہر وقت تحت سے فوق تک روبرو شاغل کے محیط رہتی ہے اور ایک پہر کے بعد معائنہ تجلی حضرت احدیت صرفہ کا ہوتا رہتا ہے"۔

سیّد مخدومؒ کی ولایت ولایتِ موسوی ہے۔ آپ کی طبیعت میں شدید جلال تھا۔ ایک مرتبہ حضرت بابا جی گنج شکر رحمت اللّٰہ علیہ سفر میں تشریف لے گئے۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ تین سالہ فرزند نعیم الدّینؒ کھیلتا کھیلتا سید مخدومؒ کے حجرہ کے قریب چلا گیا اور اند جھانکنے لگا۔ سید مخدومؒ کے حجرہ میں جو انوار برس رہے تھے ان کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ اُسی سال ایک ماہ بعد جناب فرید بخشؒ جن کی عمر ایک سال تھی، نے سید مخدومؒ کے حجرہ کی طرف منہ کر کے پیشاب کر دیا۔ اُسی آن بچھو نے کاٹا جس کے زہر سے صاحبزادہؒ اللّٰہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد بابا جیؒ نے سختی سے حکم دے دیا کہ صابرؒ صاحب کے حجرہ کی طرف کوئی نہ جایا کرے، جو جائے گا ہلاک ہو جائے گا۔ تیسرا واقعہ یوں پیش آیا کہ ایک دِن سید مخدومؒ مصروف عبادت تھے کہ بابا جی رحمت اللّٰہ علیہ کے نوجوان صاحبزادے عزیز الدّینؒ، جن کی عمر ۲۲ سال تھی، نے سید مخدومؒ کی اجازت کے بغیر لنگر تقسیم کر دیا۔ ابو القاسم بھنڈاری نے عرض کیا "میاں

صاحبزادے! مخدومؒ کی اجازت کے بغیر تقسیم نہ کرو، اگر ایسا کرنا ہی ہے تو کچھ نہ کچھ آپ کے تقسیم کے لیے رکھ چھوڑو"۔ لیکن صاحبزادہؒ صاحب نے فرمایا "لنگر تو ہمارے ابا جان کا ہے، علی احمد کیا لگتا ہے"۔ صاحبزادہؒ لنگر تقسیم فرما کر اپنی والدہ نجیب النّساءؒ ہمشیرہ شیخ ذکریا سندھیؒ کے پاس گئے اور سارا واقعہ تقسیم لنگر کا بیان کیا۔ والدہؒ نے کہا "بیٹا! تم نے اچھا نہیں کیا۔ دو صاحبزادے پہلے ان کے جلال کی نظر ہو چکے ہیں، اب تم قیامت ڈھا آئے"۔ اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، اُدھر سید مخدومؒ حجرہ سے باہر آئے اور بھنڈاری سے لنگر طلب کیا۔ اس نے کہا "حضرت! لنگر تو صاحبزادہ عزیز الدّینؒ تقسیم کر گئے ہیں"۔ آپ نے فرمایا "سارا ہی لنگر تقسیم کر دیا، کچھ ہمارے واسطے نہیں بچایا؟"۔ عرض کیا نہیں۔ فرمایا "جب عزیزالدّینؒ نے ہمارے لئے لنگر کا کوئی حصہ نہیں بچا رکھا تو خود کیسے بچ گیا؟"۔ آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا ادھر عزیزالدّینؒ اپنی والدہ سے محو گفتگو تھا کہ اچانک اسکی روح پرواز کر گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ بابا جیؒ نے فرمایا "ہم نے جب اُدھر جانے کا حکم بند کر رکھا ہے، پھر عزیز الدّینؒ نے اپنی موت کو خود آواز دی اور اپنے کئے کا ثمرہ پایا"۔

بارہ سال کے بعد سید مخدومؒ کی والدہؒ ہرات سے واپس تشریف لائیں اور اپنے علی احمد سے ملاقات کی۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ علی احمد کے بدن پر گوشت پوست ہی نہیں، صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ وہ روتی ہوئی اپنے بھائی فرید الدین گنجِ شکر رحمت اللّٰہ علیہ کے پاس گئیں اور رو کر کہا "کیا میں نے تمھیں اپنا لختِ جگر اس لیے دیا تھا کہ تم اس کا گوشت ہی اُڑا دو؟ معلوم ہوتا ہے تم نے میرے بیٹے کو بارہ سال میں ایک روز بھی کھانے کو نہیں دیا"۔ زہد الانبیاء گنجِ شکرؒ نے حیران ہو کر فرمایا "بہن! کیا کہہ رہی ہو! میں نے تو آپ کے سامنے سارا لنگر اس کے سپرد کر دیا تھا"۔ سید مخدومؒ کو بلایا گیا۔ جونہی مسعود عالم بابا جیؒ کی نظر سید مخدومؒ پر پڑی دم بخود ہو گئے۔ فرمایا "علی احمد! ہم نے تو سارا لنگر تمھیں سونپ دیا تھا، پھر تمھاری یہ حالت کیوں ہے؟"۔ سید مخدومؒ نے عرض کیا "آپ نے لنگر تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا، کھانے کے لیے ارشاد نہیں فرمایا"۔ حضرت بابا گنجِ شکرؒ نے یہ سنکر اپنی ہمشیرہؒ سے فرمایا "اللّٰہ تعالٰی نے علی احمدؒ کو کھانے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ یہ تو صابر ہے۔ دین مصطفٰی صلی اللّٰہ علیہ واٰلہ وسلم کو بلندی عطا کرنے والا ہے۔ یہ علاؤالدین ہے"۔ اس وقت آپ کو مکمل نام نامی حضرت سید مخدوم علاؤ الدّین علی احمد صابر معروف ہوا۔ سبحان اللّٰہ! ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشآءُ واللّٰہُ ذُواالْفَضْلِ الْعَظِیْم۔

چند روز کے بعد آپ کی والدہ سیدہ ہاجرہ رحمت اللّٰہ علیہا نے اپنے بھائی سے عرض کیا "بھائی جان! اپنی صاحبزادی خدیجہ بیگمؒ (یہ صاحبزادی نجیب النساءؒ بنت محمد عظیم صدیقی ملتانیؒ کے بطن سے تھیں) کا نکاح میرے صابر سے کر دو"۔ عظیم بھائی نے جواب دیا "بہن! صابر تو شادی کے قابل نہیں، اس کو غلبۂ کیفیتِ جذب سے فرصت نہیں ملتی، ازدواجی زندگی کے لیے اس کے پاس وقت کہاں!"۔ بھولی بہن نے یہ سمجھا شاید صابر کی غربت یتیمی کے پیش نظر بھائی رشتہ سے انکاری ہے۔ بہن نے اپنی بیوگی اور صابر کی یتیمی اپنے بھائی کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ شاید تم اسی لیے رشتہ دینا نہیں چاہتے۔ حضرت بابا جیؒ کو یہ بات سن کر دکھ ہوا اور کرہاً اپنی بیٹی خدیجہؒ عرف شریفہ کا نکاح سید مخدومؒ سے کر دیا۔ رات

ہوتے ہی حضرت سید مخدومؒ کی والدہؒ اپنی بہو کو لے کر حجرہ صابر پر گئیں۔ بہو کو اند بھیج دیا اور خود باہر ٹھہر گئیں۔ دلہن اندر بحضور مخدوم علی احمد صابرؒ دست بدستہ کھڑی رہی۔ حضرت سید مخدومؒ اس وقت حالتِ استغراق میں تھے۔ تہجد کے وقت جب مراقبہ فنا سے فرصت ملی تو حجرے میں عروس کو دیکھ کر فرمایا "تم کون ہو؟"۔ عرض کیا "آپ کی زوجہ"۔ فرمایا "اللّٰہ تو فرد ہے زوج سے کیا واسطہ!"۔ اسی وقت زمین میں آگ پیدا ہوئی اور حضرت خدیجہؓ کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ صبح کے وقت جب والدہؒ اندر گئیں تو منظر دیکھ کر کلیجہ منہ کو آ گیا۔ صابر مخدومؒ کے پشت پر دونوں ہاتھ مارے اور فرمایا "میں تیرے ماموں کو کیا جواب دوں گی؟ میں تیرے لیے تیرے ماموں کی بیٹی کو بیوی بنا کر لائی تھی، تم نے اسے راکھ کا ڈھیر بنا دیا"۔ سید مخدومؒ نے کہا "مجھے اس کا کچھ علم نہیں ہے"۔ اس روز سے حضرت ہاجرہؒ اس عظیم سانحہ کو برداشت نہ کرتے ہوئے بیمار ہو گئیں اور ۲ محرم الحرام ۶۱۲ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ آپ کو نمازِ جنازہ کے بعد کہوتوال (ملتان) میں دفن کر دیا گیا۔

حضرت شیخ فرید الدّین شکر قدس سرّہ العزیز نے حضرت سید مخدومؒ کے کمالات کو ملاحظہ فرمایا تو حضرتؒ کو دہلی کی قطبیت عطا فرمائی۔ چونکہ آپ کی مہر بوجہ پیار و شفقت حضرت سید جمال الدّین ہانسویؒ محبوب حضرت بابا جیؒ کے پاس رہا کرتی تھی، اس لیے ارشاد ہوا کہ سند قطبیت پر ہانسی جا کر جمال الدّین سے مہر کرا لینا۔ حضرت سید مخدومؒ ہانسی پہنچے تو جناب جمال الدین ہانسویؒ دو میل چل کر آپ کے استقبال کے لیے آئے اور بڑے احترام سے ہانسی لے جا کر اپنے پاس ٹھہرایا۔ حضرت سید مخدومؒ سواری سے نیچے نہ اترے لیکن جمال ہانسویؒ پیدل آپ کی سواری کے ساتھ رہے۔ نماز مغرب کا وقت تھا، حضرت جمال ہانسویؒ نے مسجد میں سید مخدومؒ کو امام بنایا اور نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سید مخدومؒ نے مہر لگانے کی درخواست کی۔ حضرت جمال الدینؒ نے فرمایا "حضرت! اندھیرا چھا گیا ہے، شب پھر آرام فرمائیے۔ صبح ہی آپ کی سند پر مہر ثبت کر دی جائے گی"۔ آپ نے اپنی کلمہ کی انگلی پر دم کیا جو شمع کی طرح روشن ہو گئی۔ آپ نے فرمایا "تاریکی مہر لگانے میں حائل تھی جو دور ہو گئی"۔ یہ بات سن کر جمال الدّین ہانسویؒ نے انکی سند پھاڑ دی اور کہا "بیچاری دہلی تمہارے جلال کی قوت نہیں رکھتی"۔ سید مخدومؒ ناراض ہو کر اجودھن تشریف لے آئے اور بابا جیؒ سے ذکر کیا۔ حضرت شیخ گنجِ شکر رحمت اللّٰہ علیہ نے فرمایا "پارہ کردہ جمال راہ، فرید نتو اند درخت" (جمال کے پھاڑے ہوئے کو فرید نہیں سی سکتا)۔ آپ نے فرمایا "اگر جمال کے مضطرب ہاتھ نے صابر کی خلافت کی سند چاک کر دی تو صابر کے ہاتھ نے بھی جمال کی سند کا ورق پھاڑ دیا۔ اب کوئی شخص جمال کے توسل سے فرید کے سلسلہ تک نہیں پہنچے گا"۔ لہذا حضرت ہانسویؒ کا سلسلہ حضرت تک ہی رہا، آگے نہ چل سکا۔ دو صاحبزادے تھے، ایک فوت ہو گئے، دوسرے کو حضرت ہانسویؒ جب خلافت دینے کا ارادہ کرتے تو حالت بدل جاتی۔ لہذا ان سے نہ سلسلہ جاری ہوا نہ اولاد۔

حضرت ہانسویؒ کی ملاقات جب حضرت مخدومؒ سے ہوئی تو سلسلہ جاری ہونے کے لیے دعا چاہی۔ آپ نے فرمایا "ہمارے سلسلہ سے ایک قطب ہو گا، جس کی دعا سے آپ کی نسل جاری ہو گی"۔ لہذا جب

کبیر الاولیاء جلال الدّین بانکا پیر پانی پتی رحمت اللّٰہ علیہ ہانسی میں تشریف لے گئے تو حضرت ہانسویؒ آپ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے اور نہایت احترام سے ٹھرایا اور گذشتہ واقعہ بانکا پیرؒ کے گوش گزار کر کے دعا کے طالب ہوئے۔ آپ نے فرمایا "میرے دادا پیر مخدوم صابر قدس سرہ نے آپ کا سلسلہ تو بند کر دیا ہوا ہے، میں آپ کی نسل جاری ہونے کی دعا کرتا ہوں"۔ لہذا آپکی دعا سے ایک صاحبزادہ برہان الدّینؒ پیدا ہوئے جن سے حضرت جمال الدین ہانسویؒ کی نسل جاری ہوئی اور یہ صاحبزدے نظام الدّین اولیاءؒ کے خلیفہ ہوئے (اقتباس الانوار)۔

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمت اللّٰہ تعالیٰ علیہ نے ۱۵ ذی الحجہ ۶۵۰ھ بروز دو شنبہ بعد نماز فجر حضرت سید مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر رحمت اللّٰہ علیہ کو اپنے دست مبارک سے کلیر شریف کی سند قطبیت تحریر فرما کر عطا کی۔ حضرت سید مخدومؒ فرمانِ فرید لے کر کلیر پہنچے اور مسماۃ گل زادی بنت عبد الصمد انصاری کے مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ اس عورت کا لڑکا مسمی بہاؤ الدّین اور ہمسایہ جمال الدّین آپ کے معتقد ہوئے۔ نماز عصر کے بعد ان دو صاحبان کی معیت میں جامع مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس وقت مسجد میں تقریبا دو ہزار مرد اور عورت موجود تھے۔ بہاؤ الدّین نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "یہ حضرت مخدوم علاؤ الدّین علی احمدؒ ہیں۔ قطب عالم غوث ہندؒ نے آپ کو کلیر کی قطبت پر فائز کیا ہے۔ ان سے بیعت کرو اور رشد و ہدایت حاصل کرو"۔ کوئی شخص بھی اس بات کی طرف راجع نہ ہوا بلکہ لوگوں نے مذاق اڑایا۔

دوسرے دن پھر مسجد میں تشریف لے گئے لیکن لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ آپ نے سند دکھائی، اس پر لوگ خاموش ہو گئے۔ آہستہ آہستہ یہ خبر قاضیِ شہر تک پہنچی۔ قاضی نے رئیس شہر قیام الدّین سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ قیام الدّین رئیس شہر سید مخدومؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا "اگر تم واقعی قطبِ وقت ہو تو کرامت دکھاؤ"۔ آپ نے فرمایا "کونسی اور کیسی کرامت کے طلبگار؟"۔ اس نے کہا "حرمنہ نامی میری ایک بکری تین ماہ سے گم ہے، آپ بتائیں وہ کس کے پاس ہے؟"۔ آپ نے بلند آواز سے پکارا "حرمنہ کے کھانے والے کہاں ہیں؟"۔ ستائیس آدمی آپ کے حضور پیش ہوئے۔ آپ نے فرمایا "بکری تم نے کھائی ہے!"، اس پر وہ انکاری ہوئے۔ آپ نے فرمایا "اگر تم نہیں بتاؤ گے تو ہم تمہارا جرم ظاہر کر دیں گے"۔ وہ طیش میں آ کر بولے "اتنے ہی ولی ہو تو ظاہر کر دو"۔ آپ نے بلند آواز سے فرمایا "حرمنہ تم پر کیا بیتی؟ کن لوگوں نے کھایا؟"۔ اللّٰہ کی حکمت وہ ستائیس خود ہی بولے اٹھے "ہم نے حرمنہ کو ذبح کر کے بھون کر کھایا"۔ رئیس شہر نے آپ کی ولایت کو تسلیم کر لیا لیکن قاضی تبرک کے ورغلانے پر آپ کو جادوگر کہنے لگا۔ آپ نے یہ سارے حالات بابا جیؒ کو لکھ بھیجے۔ بابا جیؒ نے اہل کلیر، خصوصاً قاضی کے نام خط لکھا کہ صابر ولی ہیں، ان کی اطاعت کرو"۔ خط جب قاضی صاحب کو دکھایا گیا تو اس نے عالم بیہودگی میں اسکو چاکر کر دیا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ آخری خط میں بابا جیؒ نے لکھا "میرے عزیز علی احمد! بحکم خدائے ذوالجلال ولایت کلیر آپ کی بکری ہے۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ اس کا گوشت کھائیں یا دودھ نوش جان کریں"۔

یہ فرمان ۹ محرم الحرام ۱۵۱ھ کو بروز جمعرات حضرت سید مخدومؒ کو موصول ہوا۔ آپ نے اس کو احتراماً چوم کر آنکھوں کو لگایا، پھر کچھ پڑھ کر آسمان کی طرف پھونکا اور زمین میں زلزلہ پیدا ہوا۔ دوسرے روز جمعہ کی نماز کے لیے حضرت سید مخدومؒ علیم اللّٰہ ابدال کی معیت میں جامع مسجد میں تشریف لائے اور منبر کے قریب بیٹھ گئے۔ لوگوں نے یہ کہہ کر کہ یہ قاضی کی جگہ ہے اٹھا دیا۔ پھر وہ دوسری جگہ بیٹھے، وہاں سے بھی اُٹھا دیا۔ یہاں تک کہ آپ مسجد سے باہر نکل گئے۔ خطبہ ہوا، نماز میں لوگ سجدہ میں گئے۔ آپ نے فرمایا "اے مسجد! سب لوگ سجدہ میں ہیں۔ تم بھی سجدہ کرو"۔ یہ حکم پاتے ہی مسجد کی چھت اور در و دیوار جنبش کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے مسجد زمیں بوس ہو گئی۔ سب لوگ اس میں دب گئے۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ آپ کی معتقدہ گل زاری بھاگی ہوئی آئی اور عرض کی "حضور! اس میں میرا بیٹا بہاؤ الدّین بھی تھا"۔ آپ نے فرمایا "جس کو ہم سے محبت ہو گی اُسے نقصان نہیں پہنچے گا"۔ علیم اللّٰہ ابدال نے بہاؤ الدّین کو نکالا، اس کے خراش تک نہ آئی تھی۔ اس کے بعد شہر میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگے، لاشیں سڑنے لگیں، اُن کو دفن کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کلیر جلالِ صابری کی نظر ہوا اور پھر کبھی آباد نہ ہوا۔ اگرچہ شاہان دہلی نے آباد کرنے کی بہت مساعی کیں۔ سید مخدومؒ کی زبان پر یہ کلمات تھے: يَا هُوَ يَا مَنْ يَا مَنْ لَّيسَ لَهٗ اِلَّا هُوَ حَقُ حَقُ حَقُ۔ آپ نے اپنے معتقدین سے کہا کہ اس سرزمین سے جلدی بھاگ جائیں۔ گلزادی، اس کا لڑکا اور چار نفر اس آبادی سے فوراً بھاگ گئے۔ حضرت بادشاہِ دو جہاں سید مخدوم علاؤ الدّین علی احمد صابر رحمت اللّٰہ علیہ شجرِ گلر کی شاخ سے ساکت کھڑے ہو گئے۔

حضرت بابا جیؒ کو تباہی کلیر کی اطلاع ہوئی۔ آپ نے اپنے تمام خلفاء کو سید مخدومؒ کی خیریت کے لیے بھیجا اور فرمایا "خبردار میرے صابر کے سامنے نہ جانا ورنہ جل جاؤ گے۔ پشت کی جانب سے خیریت طلب کرنا"۔ بارہ کوس تک صابری جلال کی آتش موجود تھی۔ جو صابر کا نام لے کر اس علاقہ میں جاتا محفوظ رہتا ورنہ جل کر خاکستر ہو جاتا۔ روئے زمین کے تمام اولیاء و اقطاب اور اغیاث آپ کی خیریت طلب کرنے کے لیے آئے۔ آپ کے پاس نہیں پہنچتے تھے۔ علیم اللّٰہ ابدال آپ کو خبر دیتے کہ فلاں بزرگ بارہ میل پر موجود ہیں، خیریت طلب کرتے ہیں۔ آپ فرماتے "ان سے کہیے آگے تشریف نہ لائیں بس حاضری قبول ہے"۔

کلیر کے نذرِ آتش کے وقت دہلی میں سلطان ناصر الدّین محمود (۶۴۵ھ - تا ۶۶۵ھ) حکمران تھا۔ کلیر کا واقع سن کر جلالِ صابر سے خائف ہوا۔ اس نے حضرت شیخ فرید الدّین گنجِ شکر رحمت اللّٰہ علیہ کی بارگاہ میں اپنے وزیر اعظم کو چٹھی دے کر بھیجا "بادشاہ دو جہاںؒ نے اپنے جلال سے کلیر کو خاکستر کر دیا ہے۔ ہمیں سخت خطرہ ہے، کوئی ایسی تدبیر فرما دیں کہ قہرِ صابری سے محفوظ رہوں"۔ حضرت بابا جیؒ نے فرمایا "ہر نماز کے بعد مخدوم صابرؒ کا نام ایک ہزار مرتبہ تلاوت کیا کرو۔ اپنی رعایا کو ہدایت کر دو کہ ان میں سے کوئی سرزمین کلیر کی طرف نہ آئے ورنہ سوختہ ہو جائیں گے"۔ اس فرمان کے چار سال بعد حضرت فریدالدّین گنجِ شکرؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دہلی کی قطبیت عطا فرما کر روانہ کیا۔

حضرتؒ کی ولایت موسوی ہے اور قلب قلبِ اسرافیلؑ پر واقعہ ہوا ہے۔ حضرتؒ کلیر کی تباہی کے بعد گلر کے ایک درخت کے تنے سے لپٹ گئے۔ بارہ سال اسی طرح عالمِ استغراق میں رہے۔ ایک دن حضرت فریدالدّین گنجِ شکرؒ کے دربار میں خواجہ حافظ شمس الدّین ترک پانی پتیؒ تشریف لائے اور سلسلہ چشتیہ میں داخل ہونے کی آرزو کی۔ حضرت بابا جیؒ نے فرمایا "فقیر کے پاس تمہارے لیے کوئی حصہ نہیں، تم سید مخدوم صابرؒ کے پاس جاؤ، انہی کے پاس تمہارا حصہ ہے ان کو گولر کے درخت سے اتارو"۔ عرض کیا "یہ کام میں کر سکتا ہوں؟"۔ فرمایا "مخدوم کی پشت سے جانا۔ اللّٰہ تعالیٰ نے تم کو لحنِ داؤدی بخشا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا۔ تلاوتِ قرآن مجید کی حلاوت سے جلالِ صابر میں کمی پیدا ہو جائے گی"۔ بابا جیؒ کے حکم کے مطابق حافظ صاحبؒ کلیر شریف پہنچے۔ سید مخدومؒ کی پشت کی جانب قرآن مجید کی تلاوت شروع کی۔ حضرتؒ کا جلال ختم ہوا اور فرمایا "تم کون ہو؟ کیا تم کو بابا جیؒ نے بھیجا ہے؟"۔ عرض کیا "حضور سب کچھ جانتے ہیں!"۔ ارشاد فرمایا " اللّٰہ تعالیٰ کا شمس آسمان پر ہے اور ہمارا شمس زمین پر!"۔ سلسلہ حنفیہ علویہ اور سلسلہ عالیہ چشتیہ میں حافظ صاحبؒ کو بیعت فرمایا۔ جوبیس سال تک حافظ صاحب ترکؒ نے سید مخدومؒ کی خدمت سر انجام دی اور اس سلسلہ میں طریقت کی تمام منزل طے فرمائیں۔

حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاء رحمت اللّٰہ علیہ کے مرید نظیر الدّین بن عیاض کی برات راستہ بھول گئی اور کلیر شریف کی سوختہ زمین سے بارہ میل جنوب کی جانب سے گذری۔ حضرت سید مخدومؒ کے گوش میں باجے کی آواز آئی۔ آپ عالم استغراق میں تھے، فوراً چشمِ مبارک کھول کر فرمایا "شمس الدّین! یہ آواز کیسی ہے؟"۔ حافظ صاحبؒ نے عرض کیا "حضور! نقارہ کی آواز ہے، کسی کی بارات جا رہی ہے"۔ فرمایا "برات کا تصور کر کے ان پر پیالہ اُلٹ دو ان کے چاروں طرف پہاڑ حائل ہو جائیں گے"۔ خواجہ شمس الدینؒ نے تعمیلِ حکم کی برات چاروں طرف سے گھر گئی اور ان کو کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ مجبور ہو کر جائے محصور میں قیام کیا۔ اہل خانہ برات کا انتظار کرتے رہے اور راہوں میں تلاش کرتے پھرے جب کوئی سراغ نہ ملا تو مایوس ہو کر سلطان المشائخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا "برات کل تک واپس آ جائے گی، تم لوگ آج یہیں ٹھہرو"۔ اسی وقت شیخ المشائخ نظام الدّین اولیاءؒ نے بادشاہ دو جہاں سید مخدومؒ کی خدمت میں عریضہ لکھا "حضرت! ان لوگوں سے غلطی ہو گئی ہے، درگذر فرمائیں"۔ شیخ کا ابدال نامہ لے کر حافظ صاحبؒ کی وساطت سے سید مخدومؒ کی بارگاہ میں پہنچا اور معافی طلب کی۔ حکم ہوا "شمس! ہم نے معاف کیا، پیالہ سیدھا کر دو"۔ جونہی پیالہ سیدھا کیا برات آزاد ہو گئی۔ شیخ المشائخؒ کے ابدال نے برات کو نصیحت کی "خبردار باجا مت بجاؤ"۔ برات صحیح و سالم پہنچنے پر شیخ المشائخؒ نے کلیر کی طرف منہ کر کے سید مخدومؒ کو سلام عرض کیا۔

حضرت سید مخدومؒ نے نورِ باطن سے ملاحظہ فرمایا کہ شہنشاہِ ہند جلال الدّین فیروز شاہ خلجی کے لشکر کو جس کی کمان بادشاہ کا بھتیجا اور داماد علاؤ الدین خلجی کر رہا ہے، شکست پر شکست ہو رہی ہے۔ حضرت نے اس کی امداد کے لیے ۶۸۹ھ میں خواجہ حافظ شمس الدین رحمت اللّٰہ علیہ کو فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا۔ لہذا آپ کا فوج میں بطور سپاہی تقرر ہو گیا۔ ۱۳ ربیع الاول شریف ۶۹۰ھ نصف شب

جمعرات کو حافظ صاحبؒ اپنے احباء کے ہمرا کیمپ میں موجود تھے۔ حاضرین کو فرمایا "ہماری طبیعت ٹھیك نہیں، تم سب چلے جاؤ"۔ جب سب رخصت ہو گئے تو اپنے خادم شیخ سیلمان سے فرمایا "چراغ ہمارے قریب کردو تا کہ ہم قرآن مجید کی تلاوت کریں"۔ پھر فرمایا "چراغ کی بتی تیز کر دو، نامعلوم آج مجھے سوائے صورت بادشاہِ دو جہاںؒ کے کچھ نظر نہیں آتا۔ خدا خیر کرے، آج کیا ہونے والا ہے؟"۔

تھوڑی دیر بعد تندوتیز اور شدید سرد ہوا چلنے لگی۔ تمام لشکر کے چراغ گُل ہو گئے، آگ سرد ہو گئی۔ حافظ صاحبؒ کا چراغ جلتا رہا اور وہ کلام مجید کی تلاوت فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں علاؤ الدّین خلجی حاکمِ لشکر حاضر ہوا۔ پہلے آپ کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ بعد فراغت عرض کیا "حضور! دعا فرمائیں اللّٰہ تعالیٰ فتح و کامرانی عطا فرمائے"۔ آپ نے فرمایا "تم نے مجھے دُعا کے قابل کیسے سمجھا؟" اس نے جواب دیا "آپ شاہِ ولایت ہیں۔ میں نے شکست کی خبر سلطان فیروز خلجی عمِ خود کو بھیجی تھی۔ وہ حضور سلطان المشائخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلطان المشائخؒ نے فرمایا شاہ ولایت اور مستجاب الدعوات، بادشاہِ دو جہاںؒ کے خلیفہ تمہاری فوج میں موجود ہیں، میری دُعا کی کیا حاجت ہے؟"۔ بادشاہِ ہند نے عرض کیا "میں ان کو کس نشان سے پہچانوں؟" فرمایا "جمعرات کی رات سخت تُند و تیز اور سرد ہوا چلے گی، سب چراغ بجھ جائیں گے، ان کا چراغ گُل نہ ہو گا۔ ان سے دُعا کرانا"۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا "ہم دُعا کرتے ہیں"۔ لہذا دُعا کی اور انگشت سبابہ پر دم کر کے قلعہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ اسی وقت برجِ حصار قلعہ سنگین کی زمین بیٹھ گئی اور لشکر اسلامی قلعہ میں داخل ہو گیا"۔ بادشاہ دو جہاںؒ نے خواجہ شمس الدّین رحمت اللّٰہ علیہ کو یہی پیشن گوئی کی تھی کہ جب ایسے حالات دیکھو حاکمِ فوج تمہارے پاس آئے تو سمجھ لینا ہمارا انتقال ہو گیا ہے۔

جب قلعہ فتح ہو گیا تو حضرت خواجہ پانی پتیؒ واپس کلیر شریف لائے۔ سید مخدومؒ کی لاش مبارکہ موجود تھی اور جنگل کے درندے اردگرد موجود تھے۔ انکو دیکھ کر درندے بھاگ گئے۔ آپ نے غسل دیا اور کفن پہنایا۔ پھر خیال آیا "کیا میں بادشاہِ دو جہاںؒ کا جنازہ اکیلا پڑھوں گا؟"۔ یہ خیال آتے ہی آپ نے دیکھا کہ جانب غرب سے ایك گھوڑ سوار آیا اور سرکارؒ کے جنازے کے قریب آ کر گھوڑے سے اُترا اور جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شمالاً جنوباً اور پیچھے جانب مشرق مخلوق ہی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ نووارد نے جنازہ پڑھایا اور مرکب پر سوار ہو کر جانا چاہتا تھا کہ خواجہ شمس الدینؒ نے لگام تھام لی اور عرض کی "حضور! آپ کون ہیں کہ آپ نے شیخؒ کی نماز پڑھائی؟"۔ یہ سن کر راکب مرکب نے گھوڑے کو دوڑایا اور تھوڑی دور جا کر نقاب جو اُٹھایا تو خواجہؒ نے دیکھا کہ خود بادشاہ ہر دوجہاں سید مخدوم علاؤ الدّین علی احمد صابرؒ ہیں اور مسکرا کر فرما رہے ہیں "ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ایك بار اور ملیں گے۔ یاد رکھو فقیر کی نماز جنازہ فقیر ہی پڑھایا کرتا ہے"۔ یہ فرما کر غائب ہو گئے۔ حضرت خواجہؒ نے حسب الحکم حضرت سید مخدومؒ کو دو سرخ پتھروں کے درمیان دفن کر دیا۔ نیز فرمایا "تم نے فنا اور بقا کے بارے میں پوچھا تھا، لہذا وہ فنا تھی اور یہ بقا ہے"۔

آپ چونکہ اکثر عالم سکر اور شان قہاری میں رہتے تھے، اس لیے لوگ آپ کے قریب آتے ہوئے ڈرتے

تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کے مریدین نہیں۔ صرف اور صرف ایک ہی مرید ہیں جو خواجہ شمس الدّینؒ کے نام سے معروف ہیں۔ آپ کا سلسلہ انہی سے چلا۔

احمد بیگ سردھنوی نے اپنی کتاب تاریخ الاولیاء یعنی تاریخِ صابر میں بروایت حضرت مولانا فتح علی صاحب جلال آبادی قدس سرہٗ بیان کیا ہے کہ نعمت صابری حضرت قطب العالم کو سینہ بہ سینہ ملی۔ آپ کے زمانہ تک (۹۳۷ھ ا۔ زمانہ قطب العالم، ۶۹۰ھ ۔ وصال مخدوم، ۲۴۷ سال) جائے مدفن حضرت سیّد مخدوم علی احمد صابر قدس سرہٗ پر کوئی نہ جا سکتا تھا کیونکہ تجلّیاتِ جلالی مانع تھیں۔ ذوالفقارِ صابری جس کو شمشیر قہاری بھی کہتے ہیں نگہدار تھے۔ جو بشر سرحدِ کلیر میں داخل ہوتا تھا، طعمۂ شمشیر برہنہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار حضرت قطبِ عالم حضرت عبد القدوس گنگوہی صاحب رحمت اللّٰہ علیہ اپنے خلفاء کے ہمراہ دہلی تشریف فرما تھے کہ چند اشخاص مرید ہونے کے لیے آئے۔ انہوں نے قطب عالمؒ سے بزرگانِ سلسلہ چشتیہ صابریہ اور اُن کے مزارات کے بارے میں سوالات کئے۔ جب ان کو بتایا کہ مزارِ صابر ظاہر نہیں ہے تو وہ طعن آمیز لہجہ میں بولے کہ یہ سلسلہ کیسا ہے جس کے بانی کا مزار ہی نہیں۔ اس سے قطبِ عالمؒ رنجید ہوئے اور دل میں حضرت مخدومؒ کے مزار کی زیارت کی تمنا ہوئی۔ آپ گنگوہ تشریف لے آئے۔ ایک شب خواب میں ندا ہوئی "عبد القدوس! میرے گھر کی صفائی کرو"۔ آپ صبح مسجد میں گئے اور اُسے صاف کیا۔ دوسرے روز بھی یہی آواز سُنائی دی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ حق تعالٰی کا گھر خانہ کعبہ ہے، اپنی روحانی طاقت سے کعبہ شریف پہنچے اور وہاں جاروب کشی کی اور اسی دن واپس گنگوہ آئے۔ تیسری شب بھی یہی آواز آئی تو روضۂ اقدسؐ پر حاضر ہو کر جاروب کش ہوئے۔ چوتھی رات پھر وہی آواز! عرض کیا "باری تعالٰی میں نہیں جانتا آپ کے کون سے گھر کی صفائی کروں؟"۔ آواز آئی۔ "جائے مدفن علی احمد صابر بھی میرا گھر ہے تم وہاں جا کر اُسے صاف کرو"۔

صبح ہوتے ہی معہ دو فرزندان اور خلفاء آپ کلیر کی طرف روانہ ہوئے۔ جب قریب سرحدِ کلیر پہنچے تو مجاوروں نے آپکو سرزمینِ کلیر میں داخل ہونے سے روکا مگر آپ نے ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ اپنے ہمرایان کو سرحد کلیر پر روک کر آپ سرزمینِ تجلیّات میں داخل ہوئے۔ قدمِ اول رکھتے ہی سرِ تسلیم خم کیا اور شمشیر قہاری رعد کی طرح گرجتی ہوئی آپ کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ مگر آپ ٹھہرے نہیں۔ ذرا آگے گئے تو آواز آئی "مردوں کا وار خالی نہیں جاتا"۔ آپ نے اپنی آستین سامنے کردی۔ شمشیر قہاری آستین کا ایک حصہ کاٹتی ہوئی غائب ہوگئی (اس دن سے آپ کی اولاد میں آستین خود بخود چھوٹی ہوتی ہے)۔ آپ جائے مدفن حضرت مخدومؒ پر حاضر ہوئے اور مراقبہ کیا۔ آواز آئی "عبد القدوس! تم ہمارے ہو اس لیے یہاں تک آگئے۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟" عرض کیا "میں آپ کی تاریخ وصال معلوم کرنا چاہتا ہوں اور آپ کا مزار بنانا چاہتا ہوں اور مریدین کے لیے اجازت چاہتا ہوں کہ وہ حاضری دیا کریں"۔ فرمایا "تاریخِ صابری تاریخ محمدی ہے، فرش تا عرش ہمارا روضہ ہے۔ روضہ تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے مریدین کو حاضری کی اجازت ہے"۔ تب آپ نے وہیں قیام فرمایا، اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیا اور میدان جائے مدفن جو ایک جنگل

تھا خوب صاف کیا۔ چند دن بعد مراقب ہو کر عرس کی اجازت طلب کی لیکن مخدومؒ نے فرمایا کہ مجھے لوگوں کا یہاں آنا پسند نہیں۔ ایک دن حضرت مخدومؒ باجد اطہر روحانی قبر شریف سے باہر تشریف لائے اور زیارتِ جمال سے مشرف فرمایا اور فرمایا "عبدالقدّوس! تم کیا چاہتے ہو؟" عرض کیا "تعمیر مزار" فرمایا "مردانِ حق کے مزارات کی اینٹیں قرآن خوانی میں تیار ہوتی ہیں" عرض کیا "میں حافظِ قرآن ہوں" تب اجازت ملی۔ آپ نے حضرت سید مخدومؒ کا مزار اقدس تا قد آدم تعمیر کیا اور اسی سال سے عرس حضرت صابر رحمت اللّٰہ علیہ کا جاری ہوا (یہ واقعہ ۹۳۷ھ کا ہے) (مجمع السرائر از حمید الدّینؒ)۔

بعض حضرات جائے مدفن کی تعمیر پر شك و شبہ کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ پیشتر ازیں حضرت مولائے کائنات علی مرتضٰی رضی اللّٰہ عنہ اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللّٰہ عنہ کے مزارات برآمد ہو کر تعمیر ہو چکے ہیں۔ شیخ محمد تھانوی برادرِ طریقت حضرت امداد اللّٰہ مہاجر مکی رحمت اللّٰہ علیہ نے شاہ مخدوم جہاں قدوسی گنگوہیؒ سے بیان کیا ہے "مکہ معظمہ میں صوفیاء کا جلوس دیکھا۔ یہ لوگ ایك صندوق بڑے احترام سے اپنے سروں پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ جب ان سے صندوق کے بارے میں دریافت کیا تو بتایا گیا کہ اس صندوق میں قطب عالم عبد القدوس گنگوہیؒ کی وہ آستین ہے جو بوقت داخلہ سرحد کلیر شمشیر قہاری سے کاٹی گئی تھی"۔ شیخ محمد تھانوی نے اسکی زیارت کی۔

بانئ سلسلۂ عالیہ سراجیہ حقانیہ حضرت محبوب المشائخ مخدوم عبد الحق سراجی صاحب قدس اللّٰہ تعالیٰ سرہ العزیز ۴۰ سے زائد سلاسل عالیہ سے فیض یافتہ ہیں اور آپ پر غلبہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ کا ہے۔ غالب سلسلے کے علاوہ جن دیگر چشتیہ صابریہ سلاسل سے حضرت مخدوم عبد الحق سراجی صاحب قدس اللّٰہ تعالیٰ سرہ العزیز کو فیض حاصل ہوا، ان میں سلسلہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ سعیدیہ محمدیہ سراجیہ، سلسلہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ کریمیہ فقیریہ محمدیہ سراجیہ اور سلسلہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ نوازشیہ محمدیہ سراجیہ شامل ہیں۔

ذالك فضل اللّٰہ یوتیہ من یَّشآء
و اللّٰہ ذو الفضل العظیم

حوالاجات:

۱۔ شمیمِ ولایت از حضرت ابو مظہر سراجی غنوثی دامت برکاتہم العالیہ۔
۲۔ حقیقت گلزارِ صابری از مخدومِ زَمَن شاہ محمد حسن چشتی صابری رامپوری رحمت اللّٰہ علیہ۔
۳۔ سلاسل اربعین از مرشدِ پاکاں سید صوفی محمد حسین شاہ مرادآبادی رحمت اللّٰہ علیہ۔

عالمِ روحانی

عُلماء اور اولیائے متقدمین نے دو عالم بیان فرمائے ہیں، ایک عالمِ امر اور دوسرا عالمِ خلق۔ ہم نے زیادہ واضح طور پر سمجھانے کی غرض سے عالمِ خلق کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک عالمِ مثال، دوسرے عالمِ مادی۔ اس طرح کُل تین عوالم ہوئے: عالمِ امر، عالمِ مثال، عالمِ مادی۔ ان تینوں کے مجموعہ کا منفرد نام کائنات ہے۔ عالم مادی میں زمین، سورج، چاند اور تمام ستارے شامل ہیں۔ عالمِ مثال اور عالمِ امر اِس تمام کائنات کی فضا میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ ہماری زمین اور ستاروں اور کُروں میں بھی موجود ہے، اگرچہ ان کے رہنے والوں کو محسوس نہیں ہوتا نہ عالمِ مثال میں رہنے والی مخلوق کو یہ کُرے محسوس ہوتے ہیں۔ قرآن میں اِس کی بابت آلِ عمران آیت ۱۳۳ اور سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ میں ہے کہ جنت زمین و آسمان کی وُسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

یہ تمام کائنات کروی شکل کی ہے، اِس کا مرکز عرشِ اعظم ہے اور اِس عرش کا مرکز عینِ ذات یا ذاتِ بحت کا جائے قرار ہے جس کو قرآن میں ثم استوی علی العرش کہا گیا ہے۔یہ ذات کی وہ حقیقت ہے جو پاک ہے اُن تمام صفات سے جو ہم اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس ذاتِ بحت کے ارد گرد ذاتی تجلیات کا عالم ہے، عرش کے سروں سے صفاتی تجلیات شروع ہوتی ہیں یعنی الطف مقابلتہً کم لطیف ہوتا جاتاہے۔ ذاتی و صفاتی تجلیات کا مبداء اگرچہ عرش ہے۔ مگر وہ تمام کائنات میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود لیکن اِس طرح مستور ہیں جیسے بادلوں میں بجلی۔ عرش کے بعد بسائط ہیں، ان کی تعداد کو اللّٰہ ہی جانتا ہے لیکن ان میں سے خاص خاص یہ ہیں: پہلے رُوحِ بسیط یا رُوحِ الاعظم ہے، دوسرے عقلِ بسیط ہے، تیسرے نفسِ بسیط ہے، نفسِ بسیط کے بعد عدمِ بسیط ہے۔ یاد رکھئے کہ ہم عرش سے عالمِ مثال اور عالمِ مادی کی طرف نزول کر رہے ہیں۔ عرش کے بعد جن بسائط کا ذکر ہوا وہ اور دوسرے عوالم جن کا اب ذکر ہو گا عرش کے چاروں طرف طبقات کی طرح واقع ہیں۔ عدمِ بسیط کے آخری سرے پر عالمِ امر ختم ہو جاتا ہے۔

عالمِ امر کے بعد عالمِ مثال ہے جس کے پہلے طبقے کا نام عالمِ ھو ہے، اس کے بعد علی الترتیب ھاھوت، لاھوت، جبروت اور ملکوت کے عوالم ہیں یہاں جنتوں کے طبقات ختم ہو جاتے ہیں اس کے بعد ناسوت یعنی دوزخوں کا ملک ہے۔ جس کے ڈانڈے ہمارے عالمِ مادی سے ملے ہوئے ہیں۔ ناسوت مادی عالم کو کہتے ہیں۔ ہم نے آسانی سے سمجھ میں آنے کے لئے یہ دوزخ کے لئے استعمال کیا ہے۔

عوالم کی یہ ترتیب نزولی ہے یعنی ہم عرش سے اس عالم مادی کی طرف آئے ہیں۔ اس میں یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ ہر عالم اس عالم کا ہر طبقہ جو جتنا عرش سے نزدیک تر ہے اتناہی یہ اپنے بعد کے عالم سے زیادہ لطیف ہے حتیٰ کہ سب سے کثیف یہ ہمارا عالمِ مادی ہے۔ اب ہم کچھ حال ارواح انسانی کا بیان کرتے ہیں کہ وہ کہاں سے اور کس طرح چل کر اس عالم مادی تک پہنچتی اور مادی جسموں میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عرش کے بعد اور اس کے ارد گرد روحِ بسیط ہے جو مخزن ہے ان تمام ارواح مجردہ کا جو خالقِ حقیقی نے روزِ اول محض اپنے حکم سے پیدا کر دی تھیں۔ ان ارواح مجردہ میں کوئی صفت سوائے محبت اور عبودیت کے نہیں ہوتی لیکن استعداد دوسرے خواص کو جذب کرنے کی بھی موجود ہوتی ہے۔ مثال روحِ بسیط کی سمندر کو سمجھو، سمندر کیا ہے؟ پانی ہے بسیط شکل میں دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سمندر مجوعہ ہے پانی کے بیشمار ایٹموں کا، جب سورج اس پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے تار ہائے نظر یعنی کرنوں سے ان ایٹموں میں زندگی یعنی حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک تار یا شعاع کی شکل میں آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں یہ تار اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آ سکتے البتہ وہ سب مل کر دکھائی دیتے ہیں تو ہم اس کو بھاپ کہتے ہیں، جب خلاء میں اس بھاپ کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ بادل کہلاتی ہے، اس بادل کو جب سردی پہنچتی ہے تو وہ پھر پانی بن کر زمین پر برس پڑتا ہے اور اپنی اصل یعنی سمندر کی تلاش میں بے اختیار نشیب کی طرف دوڑنے لگتا ہے کیونکہ سمندر سطح زمین سے نشیب ہی میں واقع ہے۔ اس میں سے کچھ پانی جس کو صراط المستقیم مل جاتی ہے دریاؤں کے وسیلے (وابتغوا الیہ الوسیلتہ) بہت جلد سمندر میں جا ملتاہے۔ کچھ پانی غلط راستے پر پڑ کر تالابوں، جھیلوں، کنوؤں وغیرہ میں قید ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ زمین میں جذب ہو کر تنگ و تاریک اور پچیدہ مادی (مثالاً ناسوتی) راہوں سے سمندر کی تلاش میں رواں دواں رہتاہے۔ ممکن ہے کہ یہ پانی ہزار ہا سال سرگرداں رہنے کے بعد اپنی اصل سے جا ملے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قیامت تک نہ پہنچ سکے "وعلی اللّٰہ قصد السبیل و منھا جائر۔" یعنی ایک سیدھی راہ ہے جو اللّٰہ تک پہنچتی ہے اور کئی راہیں ٹیڑھی میڑھی بھی ہیں۔

بیعنہ یہی حال ارواحِ مجردہ کاہے، ہر روح ایک ایٹم کی طرح روحِ بسیط میں موجود ہے۔ آفتابِ حقیقی جب کسی روح کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنی نظر حیات افروز اس پر ڈالتا ہے جس کے اثر سے یہ روحانی ایٹم لمبا ہو کر بشکل شعاع (یا بالفاظ قرآن ظل یا پرچھائیں) عالمِ اسفل کی طرف نزول کرنے لگتا ہے لیکن برخلاف پانی کے اس روحانی ایٹم کا سرا روحِ بسیط میں اپنی جگہ پر ہی قائم رہتا ہے۔ روحِ بسیط سے گزر کر یہ شعاع عقلِ بسیط میں داخل ہوتی ہے اور بقدر استعداد عقل کو جذب کرتی ہوئی نفسِ بسیط میں پہنچتی ہے اور نفس سے جو حصہ مقدر ہوتا ہے لے لیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں اس میں نفس پیدا ہو جاتا ہے (نفس کیا ہے؟ خواہش مجرد) اب یہ عدمِ بسیط میں پہنچتی ہے۔ چونکہ قانون آفرینش کے مطابق کوئی ہستی اس وقت تک مشخص نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی ضد کے مقابل نہ آئے، اس لئے عدم میں پہنچتے ہی اس کو اپنے وجود کا عرفان ہو جاتا ہے گو یہ عرفان ابھی بہت ضعیف ہوتا ہے اسی کو "انا" کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح روح عقل اور نفس کے لطائف میں گزرتے ہوئے بقدر استعداد عقل اور نفس کے خواص کو اخذ کر لیتی ہے اسی طرح عدم میں سے گزرتے ہوئے تخریب و فنا کے تاثرات اور خواص کو بھی ساتھ ملا لیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جو چیز اس مادی عالم میں ایک دفعہ پیدا ہو جاتی پھر کبھی فنا نہ ہوسکتی۔ عدم کے آخری کنارے پر عالمِ امر ختم ہو جاتا ہے گویا اب تک اس کا وجود محض اللّٰہ تعالیٰ کے علم اور ارادہ میں مستور رہتا ہے اب یہ شعاع ھو میں داخل ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات یادر کھنی چاہئے کہ ہر روح میں مبداء سے معاد تك اس کا پورا مقدر اس طرح پنہاں ہوتا ہے جس طرح بڑ کے رائی برابر بیج میں اس سے پیدا ہونے والے تناور درخت کی پوری زندگی۔ اب لامحالہ یہ روح یا تو دوزخی ہو گی یا جنتی۔ اگر دوزخی ہے تو عالمِ ناسوت کے کسی طبقے میں اس کے لئے کوئی خاص مقام مقرر ہوتا ہے جہاں مادی سفر کے بعد اس کو قیامت تك ٹھہرنا ہے۔ اگر جنتی ہے تو پھر جنت کے عوالم میں سے کسی عالم اور طبقے میں کوئی خاص جنت اس کے لئے مخصوص ہوتی ہے، اسی جنت کو اس روح کا مقامِ محمود کہتے ہیں۔

الغرض عالمِ امر کے ختم ہونے پر یہ عالم مثال کے مبینہ عوالم میں سے گزرتی ہوئی اپنے مقامِ محمود (یا دوزخی ہو تو عالمِ ناسوت میں اپنے مقام معاد) تك پہنچ جاتی ہے۔ یہاں وہ قدرے قیام کرتی ہے تا کہ اس مقام سے روشناس ہو جائے۔ حقیقتاً اسی مقام پر اس کا وجود عطا ہوتا ہے جس کو بجا طور پر روحانی وجود کہا جاتا ہے۔ اب مقامِ محمود سے روانہ ہو کر باقی عوالم کو طے کرتی ہے اور عالمِ ناسوت سے گزرتی ہوئی یہ ایثر میں داخل ہوتی ہے جو مادے کی سب سے لطیف اور آخری حد ہے۔ ایثر سے یہ خواص پنجگانہ اور دیگر مادی خواص و قوٰی کو بقدر استعداد اخذ کرتی ہوئی کسی نظامِ شمسی کے آفتاب میں جاتی ہے اور اس سے جان یا روح حیوانی کی حرارت حاصل کر کے اس کرے میں پہنچ جاتی ہے جہاں اس کو پیدا ہونا ہے اب وہ بہ انتظام و قضا و قدر کسی کھانے پینے والی چیز مثلاً پھل، غلہ وغیرہ میں داخل کی جاتی ہے اور وہ چیز اس شخص کو کھلائی جاتی ہے جو اس کا باپ بننے والا ہے، صلب پدر سے یہ رحم مادر میں منتقل ہوتی ہے، نو ماہ وہاں مادی تعمیر میں بسر ہوتے ہیں، اس کے بعد انسان بن کر عالم مادی میں پیکر مادی پہن کر جلوء افروز ہو جاتی ہے۔ اب جتنی اور جیسی زندگی مقدر ہو بسر کر کے عالم مثال میں اپنے مقامِ معاد یا مقامِ محمود کو واپس چلی جاتی ہے اور یوم الحساب تك وہی مقیم رہتی ہے۔ اس کے بعد جو مالك یوم الدین چاہے گا وہی اس کے ساتھ کرے گا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر غور کرنے کی ہے کہ روحِ بسیط میں اپنے پہلے سرے سے چل کر یہ شعاع کس طرح درجہ بدرجہ لطیف سے کثیف تر ہوتی نطفہ تك پہنچتی ہے۔ نطفہ کیا ہے؟ وہ جرثومہ یا زندہ مادی اجسام کی وہ سب سے پہلی اور لطیف ترین یونٹ جو خوردبین سے بھی بمشکل نظر آتا ہے۔ یہی وہ جرثومہ مادہ کے پیٹ میں اپنی غذا حاصل کر کے درجہ بدرجہ کثیف ہوتا جاتا ہے یہاں تك کہ مکمل ہو کر شکم مادر سے باہر نکل آتاہے۔ اب ہم بتائیں گے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح سفر آخرت کس طرح طے کرتی ہے۔ اس کے لئے اب ہم کو الٹا سفر کرنے پڑے گا یعنی عوالم میں ترتیب صعودی کا خیال رکھنا ہو گا۔

یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے عالمِ مادی سے ملا ہوا عالمِ ناسوت یا دوزخوں کا عالم ہے اب سنئے کہ اس عالم میں ہماری تحقیق کے مطابق بہتر طبقات ہیں جن میں سے شروع کے چند طبقات میں بے برگ و گیاہ ریگستان اور بیابان اور جلے ہوئے خشك پہاڑ، دہشت ناك جنگل، کھولتے ہوئے پانی کے چشمے اور جھیلیں، آتش فشاں پہاڑ اور آگ سے بھری ہوئی وادیاں ہیں۔ پینے کے پانی کا کہیں نام و نشان نہیں اور ملتا بھی ہے تو گرم اور کڑوا، درختوں میں سوائے زقوم، ناگ پھنی اور خاردار جھاڑیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے

بعد چند طبقات میں کسی قدر ٹھنڈا پانی، سر سبزی اور کچھ بہتر قسم کے جنگل اور آبادیاں ہیں۔ اس کے بعد ہر طبقہ پہلے طبقے سے بہتر ہوتا چلا گیا ہے حتی کہ بہترواں طبقہ سر سبزی و شادابی میں پچھلے تما م طبقوں سے بڑھا ہوا ہے اور عالمِ ملکوت کے پہلے طبقے کی جنتوں سے کچھ ہی کم ہے۔ اسی کو اعراف کہتے ہیں۔ یہ طبقہ ناسوت کے بالکل آخری سرے پر واقع ہے۔ اس کے آگے ایك دیوار ہے جیسا کہ سورۃ الحدید آیت ۱۳ میں ارشاد ہوا ہے۔ اس دیوار سے جنتوں کے عوالم شروع ہوتے ہیں جن میں پہلا عالمِ ملکوت ہے۔ اعراف اور جنت کے پہلے طبقے میں یہ فرق ہے کہ جنت میں کھانا پینا اور عیش و عشرت کے سامان اعراف سے بہت بہتر ہیں اور بے محنت و مشقت میسر آتے ہیں۔ اعراف میں یہ سب چیزیں گھٹیا درجے کی ہیں اور محنت و مشقت سے ملتی ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اعراف کے لوگ (یعنی روحیں) دوسروں کو اپنے سے بہتر حالت میں دیکھ کر جلتے اور رنج کرتے ہیں جس کا کرب ہی ان کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ برخلاف ازیں جنت میں ہر شخص (روح) اپنی حالت پر خوش اور مگن ہے بلکہ دوسروں کو زیادہ اچھی حالت میں دیکھ کر اور بھی خوش ہوتا ہے۔ اس طرح جنت میں خوشی ہی خوشی ہے، رنج کا نام نہیں۔ کاش ہم دنیا میں بھی یہ عادت اختیار کر لیں تو دنیا بھی جنت سے کم نہ رہے۔

اس بیان کو پڑھ کر بہت سے لوگ یہی کہیں گے کہ اگر یہی امر واقعہ ہے تو پھر (برزخ) سارے کا سارا قطاً روحانی ہے، ہرگز مادی نہیں۔ لیکن وہاں ہمارا جسم بھی تو روحانی ہوگا اور روحانی جسم کو روحانی عالم کی تمام کیفیات و کمیات مثلاً راحت، اذیت، سردی، گرمی اور نرمی و سختی وغیرہ بالکل ایسی ہی معلوم و محسوس ہوں گی جیسی کی ہمارے مادی اجسام کو اس مادی عالم میں ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن و احادیث میں عذابِ دوزخ اور وہاں کی تکالیف کا جو بیان ہے مثلاً آگ، کھولتا ہوا پانی، کھانے کو زقوم اور خاردار درخت، پینے کو گرم پانی ، لہو اور پیپ وغیرہ وغیرہ تو یہ سب بے معنی ہوتا ہے۔ اسی طرح جنتوں کے بیان میں جو حور و قصور، باغات، ماکولات و مشروبات اور دیگر لذائذ و نعائم کا ذکر ہے وہ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حق یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے کلام پاك میں بیان کیا ہے لفظًا لفظًا درست ہے اور ایك مسلمان کو اسی طرح اس پر ایمان رکھنا چاہئے اس کی اور کوئی توجیہ نہیں ہے۔

ہاں تو اعراف کے بعد جنتوں کے عوالم شروع ہوتے ہیں جن میں پہلا عالمِ ملکوت ہے۔ اس کے چھتیس طبقات ہیں جن میں سے ہر طبقہ پچھلے طبقے سے ہر لحاظ سے بہتر اور افضل ہوتا چلا گیا ہے۔ ملکوت کے بعد عالمِ جبروت اور اس کے بعد عالمِ لاہوت ہے۔ ان دونوں عوالم میں سے ہر ایك میں اٹھارہ اٹھارہ طبقات ہیں جن میں ہر طبقہ عمارت و امارات، وسعت و رفعت، سرسبزی و شادابی اور نزہت و لطافت میں اپنے پچھلے طبقے سے کہیں زیادہ بہتر و برتر ہے۔ ان جنتوں میں جو محلات، قصور، باغات، نہریں، چشمے، پھل، پھول، ماکوت و مشروبات، حوریں، غلمان وغیرہ ہیں اور جو کیف و سرور اللّٰہ تبارك و تعالیٰ کی تجلیات اور لقا سے حاصل ہوتا ہے ان سب کا بیان بخوف طوالت ترك کیا جاتا ہے جس کو شبہ ہو قرآن اور احادیث نبوی علیہ الصلوۃوالسلام کی طرف رجوع کرے۔

یہاں تك ہم نے عالمِ لاہوت کا بیان کیا ہے۔ اب ہم اگلے عوالم کا بیان کرتے ہیں لیکن ایك مرتبہ پھر

یاد دلانا ضروری ہے کہ عوالم میں سب سے بڑا فرق کثافت و لطافت کا ہے۔ عالمِ ناسوت کا پہلا طبقہ سب سے کثیف ہے۔ اس کے بعد ہر طبقہ پچھلے طبقہ سے لطیف تر ہوتا گیا ہے حتیٰ کہ عرش اور اس کے مرکزی نقطہ پر جہاں عین ذات کی حقیقت ہے اس لطافت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب سنئے کہ عالمِ لاہوت کے بعد عالمِ ہاہوت ہے جس کے چودہ طبقات ہیں۔ اس عالم کا پہلا طبقہ لطافت میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہاں کی جنتیں اور ان کے قصور بڑی صاحب بصیرت روحوں کوبھی محض دھندلے نقوش کی طرح نظرآتے ہیں۔ اگلے طبقات میں یہ نقوش اور بھی لطیف ہوتے ہوتے محض خیالی رہ جاتے ہیں اور چودھویں طبقے میں تو صور و اشکال کا تخیل بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں صرف اولیاء اللّٰہ کی روحیں رہتی ہیں جو عرفان میں کمال حاصل کر کے اس دنیا سے گئے ہیں۔ اس کے بعد عالمِ ھُو ہے۔ اس کے طبقات کا فرق متمیز نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہر اگلا قدم پچھلے قدم سے زیادہ لطافت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ ایک نور کا سا میدان ہے جہاں تجلیات الہیٰ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور ان تجلیات ہی میں ہر قسم کی لذتیں اور کوائف موجود ہیں۔

عالمِ ھُو ان بزرگوں کی روحوں کا مسکن ہے جنہوں نے قرآنی آیت "وتبتل الیہ تبتیلا" پر عمل کامل کیا اور حقیقی معنوں میں دنیا کی ہر چیز سے تعلق قلبی قطع کر کے صرف اللّٰہ کے ہو گئے۔ دراصل جنتوں کے طبقات عالمِ لاہوت پر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ہاہوت اور ھُو جنتوں کے طبقے نہیں ہیں بلکہ جنتوں کے طبقات کی روح یا معنوی شکل ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں کہا گیا ہے کہ "دوزخ بہت ہی بری جگہ ہے خواہ مستقلاً رہنے کے لئے ہو یا عارضی قیام کے لئے" پھر اس رکوع کے آخر میں ارشاد ہوا کہ "جنت بہت اچھی جگہ ہے خواہ مستقلاً رہنے کے لئے ہو یا عارضی طور پر ٹھہرنے کے لئے"۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ دوزخ سے تو گناہگار عذاب بھگتنے کے بعد جنت میں چلے جائیں گے لیکن جنتی جنت میں عارضی طور پر قیام کرنے کے بعد کہاں جائیں گئے تو وہ اگلے مقامات یہی ہاہوت اور ھُو کے طبقات ہیں یہاں صرف انہیں بزرگوں کی روحیں رہیں گی اور رہتی ہیں جنہوں نے جیتے جی اللّٰہ کی محبت میں فنا ہو کر اس کا تقرب حاصل کر لیا اور جس روح کو جتنا زیادہ تقرب حاصل ہوگا وہ اتنا ہی عرش کے نزدیک والے طبقے میں رہے گی۔

عالمِ ھُو کے بعد علی الترتیب عدمِ بسیط، نفسِ بسیط، عقلِ بسیط اور پھر روحِ بسیط ہے پھر عرشِ کبریا اور اس کے مرکز میں ذات بحت یا وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جس کی بابت وہ خود فرماتے ہیں "سبحان ربك رب العزۃ عما یصفون"۔ یہی وہ ذات ہے جس میں کوئی صفت موجود نہیں یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ تمام متضاد صفتیں اس طرح جمع ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی بالخصوص موجود نہیں کہی جا سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ بہ یك وقت سب کچھ موجود ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر اس ذات بحت کی بھی کوئی حدود و انتہا نہیں ہے۔ ہر طالب اپنی اپنی استعداد کے مطابق دیکھتا اور عرفانِ حقیقت حاصل کرتا ہے اور اسی میں سب سے آگے کہیں وہ مقام ہے جہاں سرکار دو عالم ﷺ بھی فرماتے ہیں (بے اختیار پکار اٹھتے ہیں) " ما عرفناك حق معرفتك"۔

مندرجہ بالا بیانات سے آپ اتنا تو سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کی روح ایك شعاع کی طرح ہے جس

کی چوٹی یعنی پہلا سرا روحِ بسیط ہے، دوسرا انسان کے جسم میں۔ سورۃ ہود میں ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو اللہ اس کی چوٹی سے پکڑے ہوئے نہ ہو: "ما من دابۃ الا ھو اخذ بنا صیتھا"۔ اس چوٹی سے ہی روح کا پہلا سرا مراد ہے۔ چونکہ ہم یہ بیان کرنے والے ہیں کہ اس روح کے خواص کیا ہیں اور اس جسم فانی سے نکلنے کے بعد یہ کس طرح سفر آخرت طے کرتی ہے اور یہ مضمون بہت ہی مشکل ہے اس لئے آسانی کی خاطر ہم اس شعاع کے پہلے سرے کو الف اور دوسرے کو جیم کہیں گے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ الف اور جیم کے درمیان ہر روح کا مقامِ محمود ہے جہاں روح وجود امری سے وجود مثالی اختیار کرتی ہے اس مقام کو بے لکھیں گے۔ اس طرح پوری شعاع کا نام ہوا: ا ب ج۔ اب ہم ا ب ج کے کچھ خواص بیان کرتے ہیں جس سے بہت سے نادر و نامعلوم نکات واضح ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سفرِ واپسی کس طرح طے ہوتا ہے۔ سلاست و وضاحت کی پوری کوشش کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ یہ باتیں اہلِ بصیرت و اہلِ عرفان حضرات کے سوا اوروں کی سمجھ میں پوری طرح ہرگز نہ آئیں گی۔ تاہم جو کچھ لکھا جاتا ہے ابلاغِ علم اور تفکر کی غرض سے ہے۔

اب روح کی خواص و تاثرات کا جو کچھ قلیل علم و عرفان اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو عنایت فرمایا ہے اس کا بیان سنئے۔

۱۔ روح ایک شعاع ہے۔ یہ شعاع جب تک اللہ کا حکم یعنی موت نہ آئے ہمیشہ اور ہر وقت ا سے ج تک قائم رہتی ہے۔ یعنی کوئی چیز نان کنڈکٹر بن کر اس کو منقطع نہیں کر سکتی۔ سورۃ الفرقان آیت ۴۵ اور ۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے: الم تر الی ربک کیف مدالظل ولو شاء لجعلہ ساکنا ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا ثم قبضنہ الینا قبضا یسیرا۔ یعنی کیا تم نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کتنی لمبی کر دی ہم نے پرچھائیں۔ ہم چاہتے تو اس کو ٹھہرائے رکھتے لیکن پھر ہم نے سورج کو اس کی دلیل بنایا۔ پھر کھینچ لیا اس پرچھائیں کو اپنی طرف سہج سہج۔ علمائے ظواہر نے یہاں ظل سے مراد مادی اشیاء کا سایہ لیا جو سورج سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے سائے کے لئے ضروری ہے کہ سورج پہلے سے موجود ہو۔ حالانکہ آیت میں پہلے پرچھائیں یا سایہ کو لمبا کرنے کا ذکر ہے اور یہ کہ "ہم چاہتے تو اسے وہیں قائم رکھتے"۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ پھر ہم نے سورج کو دلیل بنایا اور پرچھائیں کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کا مفہوم کچھ اور ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو یہ دکھانا چاہا ہو کہ انسانی روح کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا "دیکھو ہماری طرف" جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو اللہ نے روحِ بسیط کی ایک روح مجرد کو حکم دیا "ہو" یہ حکم ملتے ہی اس روح نے شعاع، پرچھائیں یا ظل کی صورت اختیار کی اور بڑھ کر زمیں تک آگئی۔ لیکن چونکہ اس کا پیدا کرنا مقصود نہ تھا اس لئے اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف (یعنی روح بسیط میں) کھینچ لیا اور رسول اللہ ﷺ کو فرما یا کہ یہ طریقہ ہے جو ہم نے آپ کو دکھایا۔ باقی باتیں آپ سورج کی دلیل سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی شعاعیں کس طرح اس زمین کی مخلوقات کو زندہ رکھتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہر حال یہ آیت اہلِ بصیرت کے تفکر کے لئے ایک بڑی نشانی ہے۔

۲۔ یہ شعاع اس قدر لچکیلی اور سریع السیر ہے کہ انسان پیدل یا سواری پر چاہے جس رفتار سے حرکت کرے اور جہاں چاہے جائے یہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے۔

۳۔ ا سے ب اور ب سے ج تک اس شعاع کے ہر ذرہ میں اس انسان کا ایک پیکر مثالی (یا ہمزاد) موجود ہوتا ہے جو ہو بہو اسی کا ہمشکل ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ج سے جس قدر آگے چلو ہر جسم پیچھلے جسم سے لطیف تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ حقیقت میں ایک ہی جسم کے لا انتہا مثنیٰ ہیں ان کی بابت نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے جسم ہیں نہ یہ کہ یہ سب ایک ہی جسم ہے۔ الفاظ میں یہ بات سمجھانا بہت ہی دشوار ہے۔ مندرجہ ذیل مثال سے شاید کچھ سمجھ میں آ جائے۔ سینما ہال کا تصور کیجئے۔ ایک طرف آپریٹز روم ہے دوسری طرف پردۂ سیمیں اور دونوں کے بیچ میں دو سو فٹ لمبا ہال۔ آپریٹز روم میں انجن اور مشینری وغیرہ ہے۔ ایک چرخی پر فلم چڑھا ہوا ہے جس کے سامنے دیوار میں ایک سوراخ ہے۔ آپریٹر فلم پر پیچھے سے روشنی ڈالتا ہے جو ایک تصویر پر پڑھتی ہے اور تصویر روشنی کی شعاعوں پر سوار ہو کر ہال کی خلاء میں سے گزرتی اور پردہ پر زیادہ بڑی ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔ مثلاً اس فلم کو روحِ بسیط خیال کیجئے اور اس تصویر کو جو روشنی کے ذریعہ پردہ تک بھیجی گئی ہے، روحِ مجرد۔ پیچھے سے جو روشنی پڑ رہی ہے اس کو اللّٰہ کا نور، ارادہ یا حکم۔ فلم کی سطح سے پردہ تک جو خلاء ہے اس کو عالمِ مثال اور خود پردہ کو عالمِ مادی۔ اب ہمارے ایک سوال کا جواب دیجئے۔ فلم سے پردہ تک جو خلاء ہے کیا اس میں کوئی ذرہ بھی ایسا ہے جہاں وہ تصویر موجود نہیں اور بتائیے کہ یہ ایک ہی جسم ہے یا بہت سے۔ مثال یقیناً دوسری باتوں کے لحاظ سے ناقص ہے مگر سمجھانے کے لئے ہمیں اس سے زیادہ اچھی اور مثال معلوم نہیں۔ اس مثال پر غور کریں اور فلم پر جو روشنی ڈالی جاتی ہے اس کو نور خدا فرض کر لیں تو آپ پر اللّٰہ نور السموات والارض کا مطلب بھی خوب اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

۴۔ انسان کا دماغ اس کے حواس پنجگانہ، عقل اور تجربہ سے جو علم حاصل کرتا ہے وہ مثالی اجسام کو بھی ان کی متناسب لطافت کے لحاظ سے منتقل ہوتا رہتا ہے، بصیرت باطنی بھی۔

۵۔ انسان کا قلب جن جذبات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے وہ مثالی اجسام پر بھی تدریجاً موثر ہوتے ہیں۔

۶۔ انسان کا نفس عقائد و اعمال کی وجہ سے جو رنگ پکڑتا ہے وہی رنگ ان مثالی اجسام پر بھی تدریجاً چڑھتا ہے۔

۷۔ انسان میں نیک یا بد اعمال سے کردار کی جو طاقت یا کمزوری پیدا ہوتی ہے وہ مثالی اجسام میں بھی تدریجاً پیدا ہوتی ہے۔

۸۔ یہ شعاع انسانی ارادے کی قوت کے مطابق چشم زدن میں کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حرکت کر سکتی ہے۔ اگر یہ شعاع کسی کامل ولی اللّٰہ کی روح ہو تو وہ ولی اللّٰہ اپنی قوت ارادی سے (بحکم اللّٰہ تعالیٰ) اپنے کسی مثالی جسم کو اس زمین یا کائنات میں (یہ طاقت پر منحصر ہے) جہاں چاہے مجسم طور پر ظاہر کر سکتا ہے یا اپنے اس جسم مادی کو جہاں چاہے منتقل کر لیتا ہے۔ یہی وہ راز ہے کہ اکثر اولیائے اللّٰہ ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر موجود پائے گئے ہیں اور پائے جاتے ہیں۔ جس نے یہ

طاقت حاصل کر لی یا جو اس کا علم رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی معراج جسمانی تھی۔

۹۔ خط ج ب اپنے اوپر والے حصہ ب ا کے ذریعہ قضا و قدر کی طرف سے نازل ہونے والے احکامات سے اثر پذیر ہوتا ہے (یہ تقدیر ہے)۔ تمام عالمِ مادی اور عالم مثال میں اپنے ارد گرد کے ماحول کا اثر بھی اپنی کمزوری اور طاقت کے لحاظ سے قبول کرتا ہے (یہ حوادثات ہیں)۔ جسم مادی سے جو افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں ان سے بھی متاثر ہوتا ہے (یہ تدبیر ہے)۔

۱۰۔ جب تک اس خط کا تعلق نقطہ جیم سے قائم رہتا ہے یہ زندگی کہلاتی ہے۔ جب یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو اسی کو موت کہتے ہیں۔

موت اور سفرِ آخرت

جب حکم قضا صادر ہوتا ہے نقطہ ا نقطہ ب کو اور نقطہ ب نقطہ ج کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کشش کا فطرتی تقاضہ تو یہ ہوتا ہے کہ ساری شعاع ج ب سمٹ کر نقطہ ب یعنی مقامِ محمود میں جمع ہو جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ نقطہ ج ایک جھٹکا محسوس کرتا ہے اور شعاع کے تمام مثالی اجسام میں سب سے کثیف ہونے کے سبب سرے سے الگ ہو جاتا ہے۔ یا صحیح معنوں میں یوں کہئے کہ الگ کر دیا جاتا ہے۔ اسی کا نام موت ہے۔ ا ب ج کے جسم مادی کے سرے پر سے غائب ہوتے ہی اس کی جگہ وہ جسم مثالی لے لیتا ہے جو ج کے بالکل متصل تھا۔ اسی کو ہم مرنے والے کا روحانی جسم کہتے ہیں۔ ہم اس کو د کہیں گے۔ اب اگر د بہت بھاری اور کثیف ہے تو سرا د میں مقیم ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی قدر ہلکا ہے تو جتنا یہ ہلکا ہوتا ہے اسی نسبت سے شعاع ب کی طرف سمٹتی اور نقطہ د ب کی طرف بڑھتا ہے یعنی عالم ِناسوت کو طے کرجاتا ہے۔ اگر شعاع کے ناسوتی حصہ کے سارے ہی اجسام (ہمزاد) کے ہلکے ہیں تو یہ ایک دوسرے میں سما کر ایک ہی جسم بن جاتے ہیں۔ اس طرح ناسوتی عالم میں شعاع کا جو حصہ تھا سب سمٹ جاتا ہے یعنی ناسوت طے ہو جاتا ہے اور د ملکوت یعنی جنتوں کے طبقہ اول میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر شعاع کے ان حصوں کے مثالی اجسام بھی جو ملکوت، جبروت اور لاہوت میں وغیرہ میں سے گزرتے ہیں متناسب طور پر ہلکے ہوں تو شعاع اور زیادہ سکڑ کر جبروت، لاہوت یا اور آگے تک سمٹ جاتی ہے اور د اپنے مقام محمود پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی قیامت تک کے لئے سفر آخرت کا اختتام ہے۔ یہ بیان ذرا مشکل ہے اس لئے یہ بات اب ہم ذرا عام فہم انداز میں لکھتے ہیں۔

جب روح جسم سے نکلتی ہے تو نکیرین اس کو عالمِ ناسوت کے طبقہ اول میں اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں اس کو سفر آخرت شروع کرنا ہے۔ اگر یہ روح ایسے آدمی کی ہے جو عالم آخرت اور اللہ کی لقا وغیرہ کا قائل نہ تھا، یا سخت گناہگار اور صراط المستقیم سے نابلد محض تھا تو یہ روح وہیں قید ہو جاتی ہے یا عالمِ ناسوت کے طبقہ اول ہی میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ سورۃ الانعام آیت نمبر ۳۱ میں ارشاد ہوتا ہے "تحقیق نقصان اٹھایا انہوں نے جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی ملاقات کو یہاں تک کہ جب آ جائے گی قیامت ان کے پاس اچانک تو کہیں گے افسوس تقصیر کی ہم نے"۔ اسی آیت کے آخری ٹکڑے میں اور سورۃ عنکبوت کی تیرھویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے گناہوں کو بوجھ فرمایا ہے۔ اس لئے جو روح جتنی زیادہ گناہگار ہو گی، اتنا ہی

اس کو چلنا اور آگے بڑھنا مشکل ہو گا۔ ان میں بعض روحیں اس قدر بوجھل بھی ہوں گی جو مطلق چل ہی نہ سکیں گی بلکہ مفلوج یا بیمار کی طرح ایک ہی جگہ پڑی رہیں گی۔ بہرحال یہ اپنے اپنے گناہوں کی مقدار، تعداد اور نوعیت پر منحصر ہے۔ ناسوت کے ابتدائی طبقات میں دہکتی ہوئی آگ اور کھولتے ہوئے پانی کا عذاب بھی ہے۔ جو روحیں اس عذاب کی مستحق ہیں وہاں پہنچا دی جاتی ہیں۔ بر خلاف ازیں جو روحیں ایمان محکم، صحیح اعتقادات اور نیک اعمال کی وجہ سے ہلکی پھلکی، لطیف اور طاقتور ہوئی ہیں وہ بجلی جیسی تیزی سے عالمِ ناسوت یعنی طبقات دوزخ کو طے کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے مقامِ محمود پر پہنچ جاتی ہیں۔ اتقیا، اصفیاء، شہداء اور اولیاء کی ارواح اس قدر لطیف اور طاقتور ہوتی ہیں کہ چشم زدن میں اپنے مقام محمود پر پہنچ جاتی ہیں اور انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کس وقت طبقات دوزخ میں سے گزرے تھے۔ تمام جنتی ارواح کی سمت سفر اللّٰہ کی طرف ہوتی ہے۔ اسی واسطے فرمایا ہے: ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' اور یوں بھی ارشاد ہوتا ہے: ''کل نفس ذائقۃ الموت۔ ثم الینا ترجعون'' یعنی ہر نفس کو مرنا اور ''ہماری طرف'' واپس آنا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''یا ایھا الا نسان انک کادح الی ربک کدحا فملا قیہ'' یعنی ''اے انسان تو جو اس کوشش سے اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے تو ضرو اس سے ملے گا'' اور یہ بھی فرمایا: ''لترکبن طبقا عن طبق'' یعنی '' تم کو چڑھنا ہے (اللّٰہ کی طرف) طبق طبق کر کے''۔ یہاں طبق طبق سے مراد عالم مثال کے وہی طبقات ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ طبق ہمیشہ ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں برابر برابر کے قطعات کو طبق نہیں کہتے۔

یہاں ہم یہ بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ ان بیانات میں جو کچھ کہا گیا اور جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً اوپر، نیچے، آگے، پیچھے، دور اور نزدیک وغیرہ یہ سب سمجھانے کے لئے ہیں ورنہ عالمِ مثال اور عالمِ امر میں اطراف، وقت اور فاصلے کے وہ اندازے ہرگز نہیں جو اس عالمِ مادی میں ہیں۔

تحریر: خواجہ عبد الحکیم انصاری نقشبندیؒ

حدیثِ دل

تصوّف نام ہے کائنات کو نقص کہ نگاہ سے دیکھنے کا بلکہ اس سے آنکھیں بند کر لینے کا۔

حضرت ابو عمر دمشقی حمت اللّٰہ علیہ

پھلی ازان

(صحابئ رسول سیدنا بلال رضی اللّٰہ عنہ کی آپ بیتی سے اقتباس)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں بہت سی خوبصورت عمارتیں تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی معمار نہیں تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں بازنطین میں پاکیزہ عقل کے گرجا کے گنبد کے نیچے کبھی کھڑا بھی ہوا لیکن ہم نے جو کچھ بھی بنایا ایک گھر اپنی عبادت کے لیے۔ محنت مشقّت کے بعد جب ہم فرش پر آرام کرنے کے لیے بیٹھے اور کھجور کے پتوں کی چھت سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ چھاؤں کو دیکھ رہے تھے تو حمزہؓ نے ہمارے کام کے بارے میں خوبصورت الفاظ ادا کئے۔ ''یہ موسیٰ علیہ السّلام کے پالنے کی طرح ہے'' اُنہوں نے کہا اور یہ تشبیہہ رسول صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم کو پسند آئی۔ حقیقتاً یہ ایک ٹھنڈی جگہ تھی، رُوح کو شگفتگی اور آنکھوں کو ٹھنڈك دینے والا ہرا بھرا سایہ۔

گو مسجد بن چکی تھی مگر ابھی نامکمل تھی۔ میرا خیال ہے کہ علیؓ نے ہمیں بتایا کہ ابھی اس میں کچھ کام کی ضرورت ہے۔ ''اس میں کچھ کمی ہے ------ وہاں اُوپر کوئی چیز کم ہے'' انہوں نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی اشارہ ----- کوئی طریقہ جس سے لوگوں کو اندر بلایا جاسکے''۔

ایک لمحے میں ہم آگے پیچھے، اُوپر نیچے ہونے لگے، یہ بحث کرتے ہوئے کہ مومنین کو نماز کے لیے بلانے کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔ اِن سب باتوں کے دوران رسول صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم اپنے ہاتھ باندھے ہوئے بیٹھے رہے۔ آپؐ نہ اس بحث میں شامل تھے اور نہ ہی اس سے الگ۔

''گھنٹا کیوں نہ استعمال کیا جائے؟''

''عیسائی گھنٹیاں بجاتے ہیں''

''طبل سے خون جوش مارتا ہے''

''قرنا؟ جیسے یہودی استعمال کرتے ہیں۔ اس کی آواز تیز ہوتی ہے''

''قرنا میں حیوانی عنصر زیادہ ہوتا ہے''

''نقّارہ؟''

ہم سب چپ ہو گئے۔ جھنڈا، گھنٹا، طبل، مینڈھے کی سینگ، نقّارہ؟ کوئی شخص مطمئین نہیں تھا۔ گھنٹا کانوں میں خراش پیدا کرتا ہے۔ نقّارہ سر پھاڑتا ہے۔ طبل خون کو اُچھالتا ہے اور جھنڈا دوسری سمت میں دُور تك جاسکتا ہے اور یہ بھی کہ یہ سونے والے کو جگا بھی نہیں سکتا۔ تب میں نے عبداللّٰہؓ بن زید کو دیکھا ----- ہمارے مدد گاروں میں سے ایک ----- وہ شرماتے لجاتے ایک ایک اِنچ آگے بڑھ رہے تھے۔ اتنے منکسر المزاج کہ ہوا کو پریشان کرنے سے بھی خوفزدہ۔ میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ سو میں نے ان کے لیے محمد صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم سے قریب اپنی جگہ خالی کر دی۔

''میں نے ایک خواب دیکھا یا رسولؐ'' اُنہوں نے کہنا شروع کیا ''اور اِس خواب میں میں نے انسانی آواز

سنی جو ہمیں نماز کے لیے بُلا رہی تھی-----" انہوں نے آخری فقرہ اتنے دھیرے سے کہا جیسے انہیں کوئی سن ہی نہ رہا ہو (ایک عام انسانی آواز)۔

میں نے فوراً محمد صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم کی طرف دیکھا۔ آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؐ عبداللّٰہؓ کی طرف جُھکے۔ "ہاں ایسا ہی ہو گا۔ یہ تمہارا خواب خدا کی طرف سے تھا۔ ایسا ہی ہو گا جیسے تُم کہتے ہو---- انسانی آواز" وہ اتنی نرمی سے بول رہے تھے کہ میں سمجھ گیا کہ ان کی بات ہی آخری بات ہے۔

یہ طے ہو گیا لیکن کون سی آواز --- کس کی --- اور کس طرح ادا کی جانے والی؟ نرم آواز، سریلی آواز یا گرجدار آواز؟ میرا ذہن آوازوں کے امکانات کے بارے میں تیزی سے کام کرنے لگا۔ بچے کی، عورت کی، بوڑھے آدمی کی، سپاہی کی، موسیقار کی، عالم کی اور تب میں نے محسوس کیا کہ رسول صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم کا ہاتھ میرے کندھوں پر ہے۔

"تمہاری آواز بلال"

پہلے تو میں سمجھ ہی نہ پایا کہ آپؐ نے کیا کہا۔ جب میں نے آپؐ کا ہاتھ اپنے کندھوں پر محسوس کیا تو نہ جانے کیوں اُچھل پڑا۔ میری غُلامانہ جبلت نے، جسے ختم کرنا مشکل ہے، مجھے بغیر سمجھے بُوجھے ہی حرکت کرنا سکھایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد میں ہر شخص کا منہ میری طرف تھا اور تب میری سمجھ میں آیا۔ لیکن میں جو اسلام کی آواز بننے والا تھا، میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ زیدؓ میرے پاس آئے۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا اور ایک ایسی بات کہی جس سے میں اب بھی فخر سے جُھک جاتا ہوں۔ "کاش میرے پاس بھی کوئی ایسی نعمت ہوتی جو میں اسلام کو دے سکتا"۔ میں اپنی تعریف کو دُہرا رہا ہوں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ جملہ زیدؓ نے کہا جن سے میں پیار کرتا تھا اور جنھوں نے مجھے بہت کچھ دیا۔

تب محمد صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم کھڑے ہوئے اور میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ محض آپؐ ہی کسی شخص کو اِس طرح دیکھ سکتے تھے لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپؐ نے زیدؓ سے کم کہا "تمہاری آواز سب سے اچھّی ہے بلالؓ! اسے استعمال کرو"۔

"یارسُول اللّٰہؐ! میں کیا کہوں گا؟"

"خدا کی حمد، رسالت کا اعلان، نماز کی طرف بلاوا، خدا کی حمد --- بس اور اتنا ہی کافی ہے"۔

جب کسی کی زندگی کا تاج اس کے سر پر زبردستی رکھا جائے تو ضروری نہیں کہ وہ اسے چاہتا بھی ہو۔ خود مُحمد صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم پر جب پہلی وحی آئی تو آپؐ نے خود کو کمبلوں میں چھپا لیا تھا۔ میں آپؐ سے اپنا مقابلہ نہیں کر رہا ہوں، محض یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے بھی کمبلوں کی حاجت ہوئی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ نہ چھپنے کی جگہ، نہ فرار کا راستہ۔

"اوپر جاؤ اور انہیں وہاں سے بُلاؤ" رسول صلی اللّٰه علیه و اٰله وسلم نے کہا- میں نے نظر دوڑائی که کہاں بھیج رہے ہیں- یہ مسجد کے پاس ایك مٹی کی چھت تھی- آپ نے اپنے مینار دیکھے ہیں --- زینے کتنے شاندار، برآمدے کتنے محفوظ اور ان کی بلندی کتنی اچھی ہوتی ہے- چڑھنے میں مؤذن کی سانس استوار ہوتی ہے اور افق پر پہلی چمك اسے نئے دن کا وقت بتادیتی ہے- اسے کالے دھاگے اور سفید دھاگے میں فرق نہیں دیکھنا پڑتا لیکن جب میں پہلی اذان کے لیے چڑھا تو مجھے چڑھنے میں امکان بھر کوشش کرنی پڑی- اپنے پورے وجود کو کھینچنا پڑا- ہاتھ کو، پیٹ کو، گھٹنے کو اور پیر کو، اور اس کے باوجود میں اب بھی کھجوروں سے نیچے تھا- لیکن سب سے بڑی بات یه ہوئی که جب میں چھت پر چڑھ گیا تو میرے ذہن میں کچھ نه تھا- میرے سامنے نقل کرنے کے لیے کوئی مثال نه تھی- نه یاد کرنے یا بھول جانے کے لیے کوئی لفظ تھے-

لیکن نیچے وہ چہرے تھے جو میری طرف اُٹھے ہوئے تھے- خدا گواہ ہے که میں بلال، پہلا مؤذن! تمہیں چہروں کے بارے بتا سکتا ہوں اور یہ بھی که وہ ہمیں دیکھ کر کس طرح بلند کردیتے ہیں- چڑھائی اکثر سر چکرانے والی ہوتی تھی لیکن چہروں نے کبھی گرنے نہیں دیا- پہلی بار، کہنے والا ایك لفظ بھی نه جانتے ہوئے، میں نے نیچھے دیکھا محمد صلی اللّٰه علیه و اٰله وسلم تیسرے ستون کے پاس تھے- ابو بکرؓ اور عمرؓ ان کے ساتھ کھڑے تھے- عمرؓ اتنے لمبے تھے که آدھے درخت تك پہنچتے نظر آتے تھے- پیغمبر صلی اللّٰه علیه و اٰله وسلم نے میری طرف اپنے ہاتھ سے بلندی کا اشارہ کیا- اس میں میری ہمّت افزائی بھی تھی اور مجھے شروع کرنے کا حکم بھی-

خدا کی حمد، رسالت کا اعلان، نماز کی طرف بلاوا، خدا کی حمد، یہی آپؐ نے کہا تھا- یہی ترتیب تھی- میں مڑا اور میں نے سوچا- پھر میں نے اپنے سر کو اپنی آواز کی گہرائیوں میں ڈال دیا-

خدا سب سے عظیم ہے، خدا سب سے عظیم ہے-
میں شہادت دیتا ہوں که اللّٰه کے سوا کوئی معبود نہیں-
میں شہادت دیتا ہوں که اللّٰه کے سوا کوئی معبود نہیں-
میں شہادت دیتا ہوں که محمدؐ خدا کے رسولؐ ہیں-
میں شہادت دیتا ہوں که محمدؐ خدا کے رسولؐ ہیں-
نماز کی طرف آؤ-
نماز کی طرف آؤ-
اچھے کام کی طرف آؤ-
اچھے کام کی طرف آؤ-
خدا سب سے عظیم ہے، خدا سب سے عظیم ہے-
نہیں ہے کوئی معبود سوا اللّٰه کے-

اب ہر دن، دن میں پانچ بار، ساری اسلامی دُنیا میں آپ ان الفاظ کو سُنتے ہیں۔ لیکن میں، جس نے پہلی بار ان الفاظ کو ادا کیا، یہ نہیں جانتا کہ یہ مجھے کہاں سے ملے۔ پیغمبر صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم نے یقیناً مجھے ان کی ترتیب بتائی تھی اور جب آپؐ کو صورت کا پتہ چل جائے تو لفظوں تك کا آدھا راستہ طے ہو جاتا ہے۔ تاہم انہیں سوچنا تو پڑتا ہی ہے۔ کیا انہوں نے جب مجھے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے اشارہ کیا تھا تو لفظ بھی دیئے تھے؟ میں تو یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ لفظ میں نے خود وضع کئے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ میرے اندر ڈھالے گئے۔

"اَللّٰہُ اَکْبَرُ" خدا سب سے عظیم ہے

جب میں نیچے آیا تو محمد صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم نے مجھے اپنے قریب بٹھایا۔ لوگ ہمارے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ کچھ بچے آئے کھلکھلا کر چلے گئے۔ ہماری جوڑی اچھی تھی۔ خدا کا رسولؐ اور غلام کا بیٹا۔ بہت دیر تك انہوں نے کچھ نہیں کہا اور میں مانتا ہوں کہ میں بھی عالمِ حیرت میں گم تھا۔ تب آپؐ کو امامت کے لیے جانا تھا۔ آپؐ اٹھے اور مجھے بازوؤں میں لیا۔ "بلال! تم نے میری مسجد مکمل کردی"۔ یہ الفاظ تھے جو آپؐ نے کہے۔

اس پر ان تمام لوگوں کے ساتھ جو میری اذان سن کر مسجد میں جمع ہوئے تھے، میں خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوا۔

میں نے! بلال نے! اپنی زندگی کو پالیا تھا۔

حدیثِ دل

تصوف خوش خلقی کا نام ہے لہٰذا جوشخص سب سے زیادہ خلیق ہے سب سے بڑا صوفی ہے۔

حضرت محمد بن امام باقرؒ رحمت اللّٰہ علیہ

کدھر جانا ہے

وہ اپنی انا اور نفس کے جھاڑ جھنکار کو روندتا ہوا پہچان اور گیان کے اک دوراہے پہ آگیا۔ یہاں اسے سمجھ نہ آیا کہ کدھر جائے۔ ایک طرف عاشقی کی گلی تھی۔ دوسری طرف محبوبیت کی جرنیلی سڑک۔ ایک دن اس نے دیر تک سر سجدے میں رکھا، پوچھتا گیا، بچھ بن گیا۔ضد میں پڑا رہا۔

گلی کی راہ میں کانٹے تھے، کھائیاں تھیں، نوکیلی چٹانیں تھیں، جن پہ پاؤں رکھیں تو سر تک کو چیر کے نکل جاتی تھیں۔ آرے کی طرح کاٹ دیتی تھیں۔ اوپر سر پہ دھوپ تھی، نیچے ریت، ہوا بھی گرم، جھلس کے رکھ دینے والی۔ اس کے پاؤں میں نہ جوتا تھا نہ سر پہ ٹوپی۔ اسے اپنے سر پیر کا ابھی ہوش تھا۔ اسی لئے سجدے میں سر رکھے وہ چپکے چپکے اس سے پیار بھی جتائے جا رہا تھا۔ کہے جا رہا تھا مجھے اپنی گلی میں آنے دو، مجھے اپنا محلے دار بنا لو، مجھے راستہ دکھا دو اور چوری چوری سجدے میں پڑا پڑا اپنے ننگے پیروں کے انگوٹھوں کو بھی دیکھے جا رہا تھا۔ وہ ابھی یہی سمجھ رہا تھا کہ پیار جتا دینے سے ہی پیار ہو جاتا ہے۔ وہ یار کی گلی کے باہر نکر پر کھڑا ہونٹ ہلائے جا رہا تھا، محبت جتائے جا رہا تھا۔ اسے ابھی علم نہیں تھا کہ جس سے پیار کی پینگیں بڑھانا ہوں اس سے وابستہ ہر شے سے پیار دکھانا پڑتا ہے۔ اس کی بنائی ہر چیز کو سراہنا پڑتا ہے، چاہنا پڑتا ہے۔ اس کی تخلیق کی ہوئی ہر صورت میں اس کی آنکھیں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔

چھوٹا موٹا شخص بھی کوئی تخلیق کرے تو اپنا خون جگر اس میں ڈال دیتا ہے۔ وہ تو خالق کل ہے۔ اس نے اتنی بڑی کائنات بنا ڈالی ہے۔ ہزاروں لاکھوں سورج، کروڑہا زمینیں، اور ان میں ایک یہ دھرتی جس پہ صدیوں سے انسان آ جا رہے ہیں۔ انسانوں کی ہزار ہا نسلیں آئیں اور چلی گئیں اور انہی کے لئے پوری دھرتی کو دلہن کی طرح سجا ڈالا۔ اس پہ پہاڑ اگائے، پہاڑوں پہ ہریالی ڈالی، ہریالی کی چھت پہ بادلوں کی گزرگاہ بنا دی۔

ان گزرگاہوں پہ بادل جھومتے ناچتے آتے، میلوں دور سے سمندر کی بوند بوند اٹھا کے سینچتے ہوئے لاتے اور اس دھرتی کا منہ دھوتے۔ پھر اس کے رخساروں پہ لال لال پھول اگتے۔ اس کے ہونٹوں پہ ذائقوں سے بھرے خوشبودار پھل مسکراتے۔ اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے خواب ناچتے۔

اتنے خزانوں سے بھری یہ ساری دھرتی اس نے دلہن کی طرح سجا کے انسان سے بیاہ دی اور حق مہر میں صرف دو بول رکھے کہ جب اس دلہن کی گود سے فرصت ملے تو میرا نام لے لینا، مجھے یاد کر لینا۔ کوئی مشکل پڑ جائے تو میری طرف دیکھ لینا۔

اس نے خود کو ہر نظر سے اوجھل رکھا کہ کہیں دھرتی کا کام نہ رک جائے مگر ہر نظر کو یہ راز بتا دیا کہ جدھر تم دیکھو گے، جدھر تک دیکھ سکو گے، تمہیں میرے سوا کیا نظر آئے گا؟ کچھ ہے تو دیکھ لو۔

ہر بصارت میں اتنی بصیرت کہاں تھی۔ دیکھنے والی آنکھیں خود کو تو دیکھ سکتیں نہیں اس لئے بصارت بھری نگاہ نے ہر دکھنے والی چیز کو اپنا سمجھ لیا۔ اپنی تخلیق، اپنی جاگیر، اپنی سہولت، اپنی چیز۔

اور ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق برتنے لگے۔

اس نے کائنات کو برتنے کے کچھ اصول بھی بتائے تھے۔ ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ دیکھو، اس دلہن کو دلہن کی طرح رکھنا۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ اس سے تمہاری توقیر ہو گی۔ تمہاری اس سے نسلیں بڑھیں گی۔ دیکھو خبردار اسے کچھ اور نہ سجھ لینا۔ اس جورو کے جبر میں نہ آ جانا۔ اسے سر پہ نہ بٹھا لینا۔ ایسا کیا تو نہ تمہارا سر رہے گا، نہ تمہارے سر میں کوئی اپنی پہچان۔ تم بھٹک جاؤ گے، گم ہو جاؤ گے اور یہ دنیا تمہارے سر پہ کوؤں کی طرح ٹھونگے مارے گی، تمہیں نوچے گی اور تمہارا حال کسی گیڈر کی اُن بدبودار ہڈیوں جیسا ہو جائے گا جسے گدھوں نے کھا کھا کے بھی نہ چھوڑا ہو۔ نہ ایسا نہ کرنا، بہت خسارے میں رہو گے۔ تم خسارے کو سمجھتے ہو نا؟

اس نے فائدے اور خسارے کی پہچان کے بڑے لیکچر دئیے اور کہا جسے تم خسارہ سمجھتے ہو وہ خسارہ نہیں ہے اور جو فائدہ سمجھے بیٹھے ہو وہ کیسا فائدہ ہے جس میں خرچ ہونے والی پہلی شے تم خود ہو۔ ہے کوئی اس کائنات میں تم سے ناپائیدار شے؟ بولو! اس نے تو یہ بھی بتا دیا کہ دیکھو یہ جو بھی تمہاری آنکھوں کو دکھتا ہے یہ دلہن ہے۔ یہ تیری ہے، یہ ساری دھرتی تیری ہے۔ اس کے پھل پھول، اس کے جانور، اس کے سارے رنگ، رنگوں کے سارے ذائقے، ذائقوں کی خوشبو، سب تیرے لئے ہے۔ انہیں برتو، انہیں استعمال میں لاؤ۔ اپنے لئے اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کے لئے جو سب تمہاری طرح میرے ہیں۔ کوئی میرا بنے نہ بنے میں تو سب کا ہوں۔ ہاں میں ہوں اور میں نے ہی سب کو بنایا ہے۔ یہ دھرتی دلہن کی طرح سجا کے تیرے ہی لئے بنائی ہے۔ خبردار! اسے تیاگ مت دینا۔ اس دلہن کو طلاق نہ دینا، یہ حرکت جائز چیزوں میں سب سے کم پسندیدہ ہے۔

یہ سب بتانے کے لئے اس نے ایک ایک کر کے اپنے ایک لاکھ چوبیس ہزار بتانے والے بھیجے جو آ آ کے اس کی باتیں بتاتے گئے۔ باتیں بڑھتی گئیں، ذہین کھلتے گئے۔ پھر ایک آخری سبق کے لئے اس نے ایک غار کی تاریکی میں اپنی تمام تر تخلیق کا حسن کل دیکھا۔ تخلیق کار کو اپنی کائنات کی تخلیق کی توجیہہ ملی گئی۔ تخلیق کا عمل مکمل ہو گیا۔ خالق کے خلق کئے ہوئے اس سراپا میں تخلیق کی معراج تھی۔ انسان کی سرشت میں رکھی ہر ہر چیز کی صفت مکمل ترین تھی۔ خالق اسے دیکھ کے پہلی بار مسکرایا اور گلے سے لگا کے اپنے دل کی ساری باتیں اس کے سینے میں بسا دیں، اس کے ہونٹوں پہ لکھ دیں کہ اب تو بولے گا اور لوگ مجھے سنیں گے، تو سامنے ہو گا اور دیکھنے والے مجھے دیکھیں گئے۔

اس شام سے پہلے تک کائنات کا خالق خود محبوب تھا۔ اس کی تخلیق کے سب سچے لوگ پیار کرنے کے لئے اسی کو تلاش کرتے تھے۔ وہ عاشقی کی گلی میں رہتے تھے اور اسی سے پیار جتاتے تھے۔ اس شام کے بعد ایک نئی راہ بن گئی۔ سارے سچے عاشقوں کا محبوب، خالق کل خود اپنی تخلیق کی معراج کو دل دے بیٹھا اور پیار کے رستے پہ چلنے والوں کے لئے بھی اس محبت کی شرط عائد کر دی کہ مجھے پانا ہے تو میرے محبوب کی گلی سے ہوتے آؤ، اس کے قدم دیکھو، اس کے پیروں کے نشان ڈھونڈو، اور ان قدموں کے نشانوں پہ قدم رکھتے آؤ۔ یہی سیدھی راہ ہے، یہی جرنیلی سڑک ہے۔

اسی دن سے تلاش پہ نکلے ہوئے لوگوں کے لئے ایک راہ کے دو رستے بن گئے۔ ایک عاشقی کی گلی، دوسری محبوبیت کی جرنیلی سڑک۔ جرنیلی سڑک کے ہر کلومیٹر پہ بڑا سا بورڈ ہوتا، منزل کتنی دور رہ گئی ہے یہ لکھا ہوتا۔ بھولنے بھٹکنے کی گنجائش ہی نہ رکھی اس میں۔ بس جو کوئی اس سڑک پہ چڑھ گیا وہ پہنچ گیا۔ وہ آٹوگان سڑک ہے، خود لئے چلتی ہے۔ بس اس پہ چڑھنا ذرا مشکل ہے۔

کہنے کو کہا گیا تھا جی بھر کے کھاؤ مگر ساتھ کہہ دیا کہ کھانے سے پہلے دائیں بائیں چالیس گھر پھر کے دیکھ لو کہ تمہارے حلق میں نوالہ اترنے سے پہلے کسی کا حلق خالی تو نہیں۔ کوئی حیرانی سے منہ اٹھائے دیکھتا کہ ہیں یہ کیسے ممکن ہے تو اشارہ ہوتا ادھر دیکھ، ادھر میرے محبوب کی طرف دیکھ۔

اس کا ایک ایک نوالہ دیکھو۔ کہو! ایک لقمہ بھی اس نے اپنے حلق میں کوئی ایسا اتارا، جب اس کا کوئی پڑوسی بھوکا رہا ہو؟ بولو! دیکھو، اس کی زندگی کا ایک ایک دن دیکھو۔ کہو کبھی اس نے کسی سے کچھ چھینا؟

تم اس راہ کو آسان سمجھتے ہو۔ ہاں آسان ہو سکتی ہے اگر تم اپنے دل میں اس دنیا کا پیار نہ رکھو اور اپنے دل کو اس دنیا کے تمام تر انسانوں کے پیار سے بھر لو۔ پھر تم میرے ہر بندے کو خوش دیکھ کے خوش ہو گے اور ہر دکھی چہرے کو دیکھنے سے تمہیں دکھ ہو گا۔ تمہارا اپنا کوئی دکھ ہو گا نہ کوئی خوشی۔ تم میرے بندوں کے لئے جیئو گے تو میرے محبوب کی راہ پہ ہو گے۔

یہ بڑی کھٹن راہ ہے۔ یہاں چلنے کے لئے اپنا قطب نما تمہیں میرے محبوب کے رستے کو بنانا ہو گا۔ وہ کیسے جیا، ایسے جینا ہو گا، وہ کیسے چلا ایسے چلنا ہو گا۔ وہ مفلس تھا، مگر حوصلہ دیکھو کہ پرواہ ہی نہ کی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اشارہ کرتا تو میں خزانوں سے بھر کے پہاڑ اس کے قدموں پہ نثار کر دیتا۔ اسکی بستی والے کم ظرف تھے۔ اس کے سچ پہ سیخ پا ہو گئے۔ کیا کیا ستم اس پہ نہ ڈھائے سب نے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ماتھے پہ ایک بل بھی آیا تو میں ساری بستی کو پہاڑوں میں پیس دوں گا۔ پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دوں گا۔ مگر اس کا میری مخلوق سے پیار دیکھو۔ وہ سختیاں تنہا جھیلتا رہا اور دل میں ملال تک نہ لایا۔ میں تو اس کے اشارے کا منتظر تھا مگر اس کا ہر اشارہ میرے ہی بندوں سے پیار کا اشارہ تھا، رحمت کا اشارہ تھا۔ بولو!میں کیوں نہ اس سے پیار کروں؟ ہے کوئی اور تیری دھرتی میں جس نے میرے بندوں سے اس سے بڑھ کے پیار کیا ہو؟ اس دھرتی میں رہ کے اس طرح رہنا آسان نہیں۔ میں نے اس دھرتی میں تیری آزمائشیں رکھی ہیں۔ اس کے پھل پھول، اس کی خوشبوئیں، ان خوشبوؤں کے رنگ، ان رنگوں کا طلسم بڑا پر فریب رکھا ہے۔ بڑے بڑے فریب کھا گئے۔ ان رنگوں سے دور جا کے رہنا اتنی بڑی بات نہیں، ان میں رہ کے اس طرح رہنا کہ ہر خوشبو، ہر رنگ، ہر ذائقے کو امانت سمجھنا یہ بڑی بات ہے۔ یہاں چلنا تلوار کی دھار پہ چلنا ہے۔ یہاں چلتے ہوئے ایک ہاتھ میں دنیا ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں اس دنیا کو برتنے کے اصول۔ ذرا سا دنیا کا پیار بڑھا گٹھڑی بھاری ہو گئی تو ادھر جھک گئے، کٹ گئے۔ اس دنیا کی گٹھڑی کو چھوڑ دیا تو بھی گر گئے، کٹ گئے۔ ہے کوئی جو دونوں گٹھڑیوں میں سے ایک گرا کے صحیح سالم اس سے گزر جائے۔

یہ راہ ہے میرے محبوب کی برتی ہوئی، جرنیلی سڑک۔ اس راہ سے گزرا ہے وہ۔ ہے کوئی جو گزر کے

دکھا دے۔ گھبرا گئے۔ میں ہوا میں باتیں نہیں کرتا۔ پہلے ثابت کرتا ہوں، پھر کہتا ہوں۔ میں نے پہلے ثابت کیا، پھر کہا۔ پہلے چالیس سال اسے تم میں رکھا، چلایا، پھرایا پھر دکھایا۔ تم نے اس کی صداقت دیکھی، مانی، اس کی امانت دیکھی، اسے تسلیم کیا۔ اسے بچے سے بڑے ہوتے دیکھا۔ اسے کھاتے دیکھا،پیتے دیکھا۔ ہر ہر روپ میں دیکھا۔ پھر اسے کہا کہ وہ تمہیں کہے میں کیا چاہتا ہوں۔ جس طرح وہ چلتا آیا ہے تم سب کو چلنا سکھائے۔ اس نے سکھایا، بتایا۔ وہ کتنے برس تمارے بیچ رہا۔ اس نے کاروبار کئے، گھر میں رہا، گلیوں میں پھرا، بازاروں میں تم نے اسے پھرتے دیکھا۔ اس نے مجھے سجدے کئے، میرے لئے تلوار اٹھائی، تمہارے لئے میرے آگے ہاتھ پھیلائے۔

تم نے ہر روپ میں اسے دیکھا۔ بولو! کبھی کسی چیز میں اسے حدسے بڑھتے دیکھا؟ ایسا اعتدال کہیں دیکھا؟ اور بولو! کوئی جھوٹ تھا اس میں؟ کوئی فساد دیکھا اس میں؟ کوئی عناد نظر آیا اس کی آنکھوں میں؟ ہے کوئی تم میں جو کہے اس نے اس کے دروازے پہ دستك دی، سوال کیا اور خالی آیا؟ کبھی دیکھا اسے کسی کا حق مارتے ہوئے؟ وہ جو دن بھر تمہاری گلیوں میں چلتا پھرتا، محنت کرتا، مزدوری کرتا، بکریاں چراتا، پھر میں اسے دو کھجوریں دیتا، وہ دو کھجوریں گھر لے جاتا تو اس کے دروازے پہ میں سوالی بھیج دیتا، وہ اس میں سے ایك کھجور سوالی کو دے دیتا۔

دیکھا کیسے کماتے ہیں، کیسے کھاتے ہیں۔ میں کمانے سے منع تھوڑی کرتا ہوں۔ میں کھانے سے بھی منع نہیں کرتا مگر میری پسند دیکھنی ہو تو اسے دیکھو۔ کیسے کماتے ہیں یہ دیکھناہے تو میرا محبوب دیکھو۔ اس کائنات کا ہاتھ پکڑ کے چلنا ہے تو دل میں میرے محبوب کی محبت پالو۔ میرے رقیب بنو، نہ ڈرو نہیں۔ میں تو اپنے رقیبوں سے پیار کرتا ہوں۔ میں نے اس راہ پہ چلنے والوں پہ واجب کر دیا ہے کہ اس راہ پہ چلنا ہے تو میرے محبوب کی مدح سرائی کرو جیسے میں خود کرتا ہوں۔ ایسا کرو گے تو تم میرے ساتھی ہو، میں تمہارا۔

ڈر کیوں رہے ہو؟ جانتا ہوں تمہیں صبح سے شام تك وسوسے گھیرتے رہتے ہیں۔ ڈر اور خوف تمہارے دلوں میں پلتے ہیں۔ ہاں جو ہم سے دور ہو جائے اسے ہم اسی خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جینے کا خوف، مرنے کا ڈر، پانے کی ہوس، پا کے چھننے کا اندیشہ، نہ ملنے پہ مایوسی، قدم قدم رنج، قدم قدم پہ ڈر، حالانکہ ہم نے کہہ دیا ہے کہ جو دو قدم ہماری طرف آتا ہے ہم بیس قدم اس کی طرف چلتے ہیں۔ جانتے ہو ہمارا ایك قدم کتنا ہوتا ہے؟ اپنے قدم سے نہ ناپو۔ تم میں اور ہم میں بہت فرق ہے اور جب ہم قریب آتے ہیں کسی کے تو پہلی تکلیف جو اس سے دور کرتے ہیں وہ یہی ہوتی ہے، خوف۔ ہاں خوف ہمارے دوستوں کے لئے نہیں ہے۔ ہماری کائنات ان کی ہے اور کائنات کی کسی شے سے ان کے لئے کوئی وسوسہ نہیں، کوئی حزن نہیں، کوئی ڈر نہیں، کوئی خوف نہیں۔ وہ امن میں ہوتے ہیں۔ خوشی ان کے دلوں پہ لمحے بھر کے لئے دستك نہیں دیتی جیسا کہ تم دنیا کی ہوس کی تکمیل سے محسوس کرتے ہو۔ میری قربت کی خوشی اور ہے۔ یہ سدا کے لئے رہنے آجاتی ہے۔ یہ امن ہے، یہی شانتی ہے، یہی سکون ہے، یہی نروان ہے۔

میری دوستی کی دو راہیں ہیں۔ ایك تو یہی جرنیلی سڑك کہ دنیا کی گٹھڑی بھی پکڑے رکھو اور

اسے برتنے کے اصول بھی نبھاتے آؤ اور اسی دو دھاری تلوار پہ چلتے آؤ۔ یہ راہ محبوبیت کی راہ ہے۔ یہ میرے محبوب سے پیار کی راہ ہے۔ یہ جرنیلی سڑک ہے۔

دوسرا راستہ مجھ سے اندھے غیر مشروط پیار کا راستہ ہے۔ یہ عاشقی کی گلی ہے۔ اس گلی میں خالی ہاتھ آنا پڑتا ہے۔ ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے۔ یہاں ننگے سر ہونا پڑتا ہے اور جانتے ہو ان سب کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ تم کہاں جانتے ہو۔ تم دنیا میں پلے بڑھے ہو۔ انعام اور سزا کی بات سمجھتے ہو۔ تم اسی طریقے سے آؤ بس جو میرے محبوب نے چلنا سکھایاہے۔ محبوبیت کی اس راہ پہ چلو گے تو راستہ بھی کٹ جائے گا، انعام بھی ہو گا۔ یہ دھرتی، یہ تیری دلہن، تیری دسترس میں ہو گی۔ یہ ساری کائنات تیرے کانوں میں تسخیر کے راز ڈالے گی۔ تم اسے مسخر کرنے میں مشغول ہو جانا۔ میں بُرا نہیں مانتا۔ یہ بنائی ہی اسی لئے ہے اور تمہیں تمہارے جسم پہ حاکم جو یہ دماغ دیا ہے ویسا دھرتی کے کسی اور ذی روح کو نہیں دیا۔ یہ اسی لئے ہے کہ مسخر کرو، چلاؤ میری دنیا کو اپنے اشاروں سے۔ میری دنیا کی نعمتیں تمام اپنے قابو میں کر لو اور انہیں انصاف سے میرے سارے بندوں اور باقی مخلوق میں بانٹتے چلو۔

یہاں ڈنڈی نہ مارنا۔ یاد رکھنا، جتنا زیادہ تمہاری جھولی میں ہو گا، اتنی ہی تمہاری ذمہ داری بڑی ہو گی۔ جھولی بڑی رکھنے کی دعا مانگو تو ساتھ ذمہ داری نبھانے کا حوصلہ بھی مانگنا ورنہ بھٹک جاؤ گے، پھٹ جاؤ گے اور ٹھکرا دئیے جاؤ گے۔ پھر تم اٹھائے جاؤ گے میری مغلوب زدہ قوموں کے ساتھ۔ نہ ایسا نہ کرنا ورنہ تم خسارے میں ہو گے اور تم کہاں واقف ہو خسارہ کیا ہوتا ہے، فائدہ کیا ہے۔

مگر وہ درویش تو فائدے او رخسارے کے مفہوم سے ناواقف تھا۔ وہ تو خالی ہاتھ تھا۔ دونوں گٹھڑیوں کو گرائے بیٹھا تھا۔ ہلکا پھلکا تھا۔ بس اس کے دل میں دنیا بنانے والے کا پیار تھا۔ وہ پہچان اور گیان کے ایک نئے دوراہے پہ کھڑا تھا۔ ایک طرف عاشقی کی بند گلی تھی۔ دوسری طرف محبوبیت کی جرنیلی سڑک۔ وہ سجدے میں سر رکھے بیٹھا رہا۔ بچوں کی طرح ضد کر لی۔ پاؤں پکڑ لئے۔ کسی صورت پاؤں چھوڑنے کو راضی نہ ہوا سوائے اس کے اس کو اس کی گلی کا راستہ ملے۔ اس کی گلی شروع کدھر سے ہوتی ہے یہ پتہ ملے۔ وہ سجدے میں پڑا پڑا چلانے لگا۔

نہ.....نہ .....جنت بنانے والے، مجھے جنت کے پھلوں کے ذائقے نہ بتا۔ مجھے نہیں چاہئیں یہ سب کہ میرے لئے سب ہیچ ہیں اور تیری محبت کی گلی کے اینٹ روڑے ان سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ یہ پھل پھول تو تُو نے یہاں بھی بہت رکھے ہیں۔ کیا ہوا جو یہاں رہنے کو دن تھوڑے ہیں۔ جب میں یہاں کی ہی گٹھڑی اتارے بیٹھا ہوں، مجھے کیوں اپنی جنت کا بوجھ دیتا ہے۔ نہ مجھے نہیں اٹھانے یہ بوجھ۔ یہ تیری نعمتیں ہیں، میں جانتا ہوں، مانتا ہوں، شکر کرتا ہوں کہ تیرے بندے ان سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مگر میری مجبوری تو دیکھ، مجھے اپنی ہر ہر نعمت میں تُو خود بیٹھا مسکراتا نظر آتا ہے۔ نہ مجھے نہ دکھا اپنی حوریں، تیری دنیا بھی بھری ہے ان سے۔ میں تیری چالاکی سمجھتا ہوں، جنہیں حوروں کا شوق ہوتا ہے وہ دنیا میں رال ٹپکاتے پھرتے ہیں۔ اِدھر کی گٹھڑی کھولے بغیر ہی پلیت کر لیتے ہیں۔ اُدھر بھی دھتکارے جاتے ہیں۔ دونوں طرف سے ان کا پتہ کٹ جاتا ہے۔ نہ وہ اِدھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے۔ تُو تو دلوں کی پرکھ رکھتا ہے۔ دیکھ میں

خالی ہاتھ ہوں، کوئی خواہش نہیں ہے میری ہتھیلی پہ کھدی۔ کوئی ہوس نہیں ہے میری آنکھوں پہ لکھی۔ مجھے تو تُو خود ہی سب سے حسین لگتا ہے۔ میں کیوں اصل کو چھوڑ کے دھوکوں میں پڑوں۔

نہ.....مجھے نہ ڈرا اپنی دوزخ سے۔ وہ جلاتی ہو گی جلنے والوں کو۔ میں تو تیرے پیار سے خود ہی سلگتا ہوں۔ تجھ سے دُروی کی جلن کیا کم ہے کسی آگ سے۔ مجھے کیا لینا دینا تیری آگ کی تپش سے۔ یہ گرم ہو گی، جلاتی ہو گی، جلاتی رہے اور جنہوں نے جلنا ہے انہوں نے ابھی سے اپنے اندر یہ آگ پال لی ہے۔ ان کی صبحیں، انکی شامیں اسی آگ میں جلتے گزرتی ہیں۔ میرے اندر تو تیرے پیار کی ٹھنڈ ہے۔ مجھے تو تیری دھوپ بھی تیری چاندنی لگتی ہے۔ تیری آگ بھی مجھے پھول پتیوں کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ اس میں میرا کیا کمال یہ تو تیرے نام کا کمال ہے جو میرے نام کو میرے اندر سے مٹا کے خود سے خود میری ہستی پہ لکھا گیا۔ یہ سب تیرا چمتکار ہے۔ میرے اندر سے سارے خوف تو تُو نے ہی نکالے ہیں۔ اس بے خوف کے دل میں سکوں تو نے ہی بھرا ہے۔ اس میں تیری دوزخ کا خوف اب کیسے آئے۔

مجھے تو صرف تیرا مسکراتا چہرہ دیکھنا ہے۔ تو اگر مجھے کسی آگ میں جلا کے مسکرائے تو جلنا ہی سعادت ہے میرے لئے۔ تیرا مسکراتا چہرہ دیکھنا ہی میری بہشت ہے۔ تو کتنا بڑا ہے، کتنا حسیں ہے، تو کتنا پیار کرتا ہے اپنی مخلوق سے، ستر ماؤں سے زیادہ۔

مجھے بھی تھوڑی سی محبت کی اجازت دے دے۔ میں نہیں سر اُٹھاؤں گا سجدے سے۔ مجھے اس محبت کی گلی میں آنے دے، عاشقی کی گلی میں آنے دے۔ تو نے یہ ساری دنیا مجھے دی۔ لو میں لوٹاتا ہوں۔ بس ایک مسکراہٹ دے دے کہ اس کی قیمت میں میری پوری ہستی اور میری ہستی کی کائنات، کچھ بھی نہیں۔ ایک بار مجھے پیارسے دیکھ لے۔ مجھے پیار کرنے کی اجازت دے دے۔

وہ درویش سجدے سے سر اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ اب اسے احساس نہیں تھا کہ اس کے پاؤں ننگے ہیں۔ اسے خیال ہی نہ تھا کہ اس کے سر پہ بھی کوئی سائبان نہیں۔ وہ تو راستہ پوچھے جا رہا تھا۔ راستہ بھی وہ جو سڑک پہ چڑھے بغیر ہی، پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوتا اس کی عاشقی کی گلی سے سیدھا اس کے کھوہ تک لے جائے۔

"اچھا بھئی، پھر آجاؤ" اسے آواز آگئی۔ "کدھر؟" وہ سجدے سے سر اٹھا کے اِدھر اُدھر دیکھ کے چلانے لگا "کدھر آؤں؟"۔ "ٹھہرو" پھر آواز آئی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ غور سے سننے لگا۔ پھر آواز آئی "اس بستی میں جا" اسے بستی کی نشاندہی کرا دی گئی۔ پھر آواز آئی "وہاں ایک دانے بھوننے والی ملے گی۔ کڑاہی اس نے آگ پہ چڑھائی ہو گی، جا اس سے پوچھ جو اس کی آگ میں بالن جھونکتا ہے اور اس کی کڑاہی سے کوئی دانہ اچھل کے باہر گر پڑے تو کھا لیتا ہے ورنہ اپنی اُجرت تک نہیں مانگتا۔ جا اس بوڑھے سے پوچھ"۔

وہ اٹھ بیٹھا اور بتائی ہوئی بستی کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے آخر وہ اس بستی میں پہنچ گیا۔ بتائی ہوئی ساری نشانیاں وہاں موجود تھیں۔ بستی کی ایک نکر پہ ایک دانے بھوننے والی چیری کے پیروں میں وہ بوڑھا خاموشی سے بیٹھا کڑاہی کے نیچے جلنے والی آگ میں سوکھی لکڑیاں، پتے اور کانٹے ٹھونس رہا تھا۔ آگ جل رہی تھی۔ گرم تپتی ریت کے اندر دانے بھج رہے تھے، تڑک تڑک ہر دانہ بج رہا تھا۔ بجتے دانے سارے

تڑک رہے تھے، ٹوٹ رہے تھے اور اسی آگ میں ان کے اندر سے پھول کھل رہے تھے۔

وہ تھوڑی دیر اس آگ کی تپتی ہوئی بھٹی کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا اور کچھ بولنے کے لئے لفظ سوچنے لگا تو آگ میں لکڑیاں ٹھونسنے والے بابے نے اس کی چپ سن لی۔ بولا "میں جانتا ہوں، کیا پوچھنے آئے ہو"۔ درویش اس کے پیروں میں پڑی سوکھی ٹہنیوں پہ کانٹے دیکھے بغیر بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کے کچھ کہنے کو لب کھولے تو بابا پھر کہنے لگا آج نہیں، پرسوں آنا۔ پرسوں بتاؤں گا تمہیں راستہ۔ پھر جدھر جی چاہے چلے جانا۔

دو دن درویش نے بستی کے باہر انتظار کیا۔ دو دن بعد وہ پھر بستی کی اسی نکر پہ گیا تو دیکھا دانے بھوننے والی اکیلی بیٹھی ہے۔ آنکھوں میں دھوئیں سے پانی نکل رہا ہے۔ ہاتھوں میں سوکھی ٹہنیوں کے کانٹوں سے خون بہہ رہا ہے۔ ماتھے پہ تیوریاں چڑھی ہیں۔ وہ خود ہی جھک جھک کر لکڑیاں آگ میں جھونک رہی تھی اور آنکھیں میچے میچے پریشان بیٹھی دانے بھون رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دانے بھوننے والی چیری سے پوچھا "ماسی وہ کدھر گیا؟ جو آگ جلاتا تھا"۔ "مر گیا پرسوں رات"۔ اس کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ پرسوں تو وہ اسے مل کے گیا تھا اور آج اس نے اسے راہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ "کیسے مر گیا؟" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی بتا کے تھوڑی مرتا ہے"

"وہ تھا کون؟"

"مجھے کیا پتہ کون تھا۔ ایک دن میرے پاس آ کے میری آگ میں بالن ڈالنے بیٹھ گیا تھا۔ مجھے سہولت ہو گئی۔ وہ بیٹھا رہا، پندرہ سال سے یہاں بیٹھا تھا، نہ کچھ لیتا تھا، نہ مانگتا تھا اور میرے پاس تھا بھی کیا کسی کو دینے کو۔ کڑاہی کے نیچے آگ جلاتا رہتا۔ کڑاہی سے اچھل کے کوئی دانہ نیچے مٹی پہ گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کے کھا لیتا۔ اچھا سکھ تھا مجھے اس مرن جوگے کا۔ میں شام کو گھر چلی جاتی تو وہ یہیں لکڑیوں پہ پڑا سویا رہتا۔ صبح میرے آنے سے پہلے جنگل سے جا کر سوکھی لکڑیاں لے آتا اور سارا دن بیٹھا ایک ایک ٹہنی توڑ توڑ کے جلاتا رہتا۔ پرسوں رات شاید سردی کچھ زیادہ تھی۔ بارش بھی ہوئی تھی۔ آگ بجھ گئی، چولہے کا نگھ آدھی رات ختم ہو گیا، تو وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ صبح میں آئی تو وہ یہاں اکڑا پڑا تھا"۔ "پھر؟" درویش سانس روکے سن رہا تھا۔

"پھر کیا کل صبح کمیٹی والے آئے اور اسے لے گئے"

"کہاں؟"

"وہ کدھر لے جاتے ہیں؟ تمہیں نہیں پتہ؟ جا میرا دماغ نہ کھا"۔ وہ پھر جھک کے سلگتی آنکھوں سے دھویں سے بھری آگ میں پھونکیں مارنے لگتی ہے۔

"نہیں میں پردیسی ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں"

"اچھا اچھا سارے ہی پردیسی ہیں کاکا یہاں، ہے کون یہاں کا، جا کام کر۔ مجھے کام کرنے دے۔ جتنی پھونکیں رہ گئیں ہیں وہ مارنے دے"

درویش منتیں کرنے لگتا ہے "ماسی خدا کے نام سے بتا دے"

"جا، جا کے بستی کے باہر کوڑے کچرے کے ڈھیر دیکھ" ماسی نے کہہ کے جان چھڑائی۔

درویش بھاگم بھاگ بستی کے باہر گندگی اور کچرے کے سارے ڈھیر دیکھ لئے۔ ناک پہ ہاتھ رکھے وہ غلاظت کے ہر ڈھیر کے پاس گیا۔ مردہ جانوروں کی ہڈیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ کتے، بلیاں، گیدڑ اور گدھ مردہ جسموں کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ ایسے ہی ایک ڈھیر پہ اس بابے کا مردہ جسم پڑا تھا۔ ہاتھ کہیں تھے، بازو کہیں تھے۔ کئی جانور اپنے پنجوں اور تھوتھنیوں سے اس کے جسم کی بوٹیاں کھینچ رہے تھے۔ درویش کے ہاتھ پیروں میں رعشہ آ گیا۔ ایک طرف بابے کی کھوپڑی پڑی تھی اور ایک جانور اسے چبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھوپڑی کے اندر سے بابے کی آواز آئی "آ گئے؟"۔

درویش سہم گیا۔ پھر آواز آئی "تمہیں جواب چاہیے نا؟ میری طرف دیکھو، دیکھو میں نے اپنا آپ خالی کر کے اسے اندر بٹھا لیا۔ پھر اس کے پیروں میں بیٹھ کے ساری عمر گزار دی۔ اپنے نفس کے سارے کانٹے، اپنی انا کی آگ میں ساری عمر جلائے۔ خواہشوں کے بھانبڑ لگائے۔ ایک ایک کانٹا اس کی مخلوق کے پیروں سے چنا کہ کوئی اس کا بنایا ہوا بندہ زخمی نہ ہو، دکھی نہ ہو، اب دیکھ لو"۔

اس کے ہنسنے کی آواز آنے لگی۔ جانور اس کی کھوپڑی چبانے لگا۔ "دیکھو میرا جسم مر کے بھی اس کی مخلوق کے کام آرہا ہے۔ میرا اپنا تھا ہی کیا؟ سب اس کا تھا، اسے دے دیا۔ اس کی مخلوق کو دے دیا۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ اسے کیا غرض ہے۔ یہ ہے بے نیاز سے پیار کرنے کی گلی۔ بولو! تم نے کدھر جانا ہے؟"۔

تحریر: ابدال بیلا صاحب

حدیثِ دل

تصوف صفائے قلب کا نام ہے مخالفت سے (یعنی مخالفتِ حق سے)۔

صوفی وہ ہے جس کی ہستی کو نیستی نہیں اور نیستی کو ہستی نہیں (یعنی جو کچھ وہ پا لیتا ہے اس کو ہرگز گم نہیں کرتا اور جو کچھ گم کرتا ہے اسکو ہرگز نہیں پاتا)۔

حضرت شیخ حصری رحمت اللہ علیہ